مواعظ حکیم الامت اور دینی رسائل کی اشاعت کا امین

ماہنامہ الامداد لاہور پاکستان

مدیر مسئول (مولانا) مشرف علی تھانوی

مدیر ڈاکٹر خلیل احمد تھانوی

جلد ۱۷ | محرم ۱۴۳۸ھ | اکتوبر ۲۰۱۶ء | شمارہ ۱۰

النفحات فی الاوقات

بعض اوقات میں اللہ تعالیٰ کی خصوصی توجہ

ازافادات

حکیم الامۃ مجدد الملۃ حضرت مولانا محمد اشرف علی تھانوی قدس سرہٗ

عنوانات و حواشی: ڈاکٹر مولانا خلیل احمد تھانوی

قیمت فی پرچہ =/ ۲۰ روپے　زرسالانہ =/ ۲۰۰ روپے

ماہنامہ الامداد لاہور
۳۵۴۲۲۲۱۳
۳۵۴۳۳۰۴۹

پتہ دفتر
جامعہ دارالعلوم الاسلامیہ رجسٹرڈ
۲۹۱۔ کامران بلاک علامہ اقبال ٹاؤن لاہور

ناشر: (مولانا) مشرف علی تھانوی
مطبع: ہاشم اینڈ حماد پریس
۲۰/۱۳ ریٹی گن روڈ بلال گنج لاہور
مقام اشاعت
جامعہ دارالعلوم الاسلامیہ رجسٹرڈ لاہور پاکستان

النفحات فی الاوقات

بعض اوقات میں اللہ تعالیٰ کی خصوصی توجہ

نمبر شمار	عنوانات	صفحہ
۱	تمہید	۹
۲	تجلی کا معنی	۱۰
۳	اشکال کا جواب	۱۱
۴	اصطلاحات فن تصوف	۱۲
۵	تدوین تصوف کی وجہ	۱۳
۶	حدیث کے معنی	۱۴
۷	توجہ حق تعالیٰ	۱۴
۸	طرز شارع علیہ السلام	۱۵
۹	شریعت میں بعض احکام مذکور نہ ہونے کی وجہ	۱۶
۱۰	اعتقاد تقدیر کا فائدہ	۱۷
۱۱	رنج طبعی کا فائدہ	۱۹
۱۲	حزن وغم کے درجات	۱۹

۱۳	مسئلہ تقدیر میں تفصیلی بحث مباحثہ کی ممانعت	۲۱
۱۴	حصولِ توجہ	۲۲
۱۵	حضور ﷺ کے ورقہ بن نوفل کے پاس جانے کی وجہ	۲۴
۱۶	ورقہ بن نوفل حضور ﷺ سے افضل نہیں تھے	۲۵
۱۷	جذب خاص ہے اور سلوک عام	۲۶
۱۸	سلوک و جذب	۲۷
۱۹	عمل کا درجہ	۲۷
۲۰	ہمارے اعمال کا حال	۲۹
۲۱	بعض لوگوں پر رحمت خداوندی	۲۹
۲۲	حق عظمت	۳۰
۲۳	حق تفویض	۳۱
۲۴	حق تواضع	۳۱
۲۵	حق تعالیٰ کی صفات کا مقتضی	۳۲
۲۶	توجہ کے درجات	۳۲
۲۷	حق تعالیٰ کے کمال کا مقتضی	۳۳
۲۸	عارفین کے متوجہ الی اللہ ہونے کی حقیقت	۳۴
۲۹	مذاقِ عشاق	۳۵

۳۰ .... درجاتِ توجہ ۳۵
۳۱ .... نفع مراقبہ ۳۶
۳۲ .... ذکر اسم ذات ۳۷
۳۳ .... ہندو مسلم اتحاد کا انجام ۳۸
۳۴ .... تفسیر قرآن میں قواعد عربیت کا لحاظ ضروری ہے ۳۹
۳۵ .... ذکر اسم ذات کا منشاء ۴۰
۳۶ .... حضرات صحابہ رضی اللہ عنہم اور ذکر ۴۱
۳۷ .... اجر ذکر ۴۲
۳۸ .... مشاہدہ و معائنہ ۴۳
۳۹ .... رؤیت باری اس دنیا میں ممکن نہیں ۴۳
۴۰ .... شعراء کی بیباکی ۴۵
۴۱۔ .... عطاء کی ناقدری ۴۷
۴۲ .... لیڈروں کا حال ۴۸
۴۳ .... سبقت توجہات ۵۰
۴۴ .... تاثیر توجہ ۵۱
۴۵ .... اشکال کا جواب ۵۱
۴۶ .... دوام توجہ ۵۳

۴۷	مرغوب ومرہوب	۵۴
۴۸	محبت کا اثر	۵۴
۴۹	عارفین کی محبت کا حال	۵۵
۵۰	مراقبۂ محبتِ حق	۵۵
۵۱	محبت الٰہی کی حقیقت	۵۷
۵۲	اشکال کا جواب	۵۸
۵۳	محبت الٰہی بڑھانے کا مراقبہ	۵۹
۵۴	نقصِ طاعات	۶۰
۵۵	تعیین طریق	۶۳
۵۶	توجہ الی اللہ کے مختلف طرق	۶۴
۵۷	اختلاف الوان	۶۵
۵۸	خلاصہ وعظ	۶۵

وعظ

النفحات فی الاوقات

بعض اوقات میں اللہ تعالیٰ کی خصوصی توجہ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

حکیم الامت قدس سرہٗ کے وقف کردہ مکان واقع تھانہ بھون میں بتاریخ ۴ شوال المکرّم ۱۳۴۴ھ بروز سوموار کو بوقت صبح کرسی پر بیٹھ کر تین گھنٹے تک النفحات فی الاوقات کے موضوع پر یہ وعظ ہوا۔ سامعین کی تعداد تقریباً ۵۰ تھی۔ مستورات اس کے علاوہ تھی۔ حضرت مولانا ظفر احمد صاحب عثمانی مرحوم نے اسے قلمبند فرمایا۔ تفصیلی تسوید ۲۸ ذی الحجہ ۱۳۴۴ھ کو شروع ہو کر ۲ محرم الحرام ۱۳۴۵ھ کو ختم ہوئی۔

حکیم الامت نے وعظ میں حدیث پاک کی تشریح فرماتے ہوئے فرمایا کہ حق تعالیٰ بعض اوقات ہماری طرف ایک خاص طور سے متوجہ ہوتے ہیں جس کو نفحات سے تعبیر فرمایا تو ضرورت اس کی ہے کہ ہم بھی ان کی طرف متوجہ ہوں۔ کامیابی کے لئے یہ ضروری ہے۔

اللہ تعالیٰ سب قارئین کو اس بات کو سمجھنے اور اس پر عمل پیرا ہونے کی توفیق عطا فرمائیں۔ آمین

خلیل احمد تھانوی

۱۷/ جمادی الاول ۱۴۳۷ھ

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

خطبۂ ماثورہ

الحمد للّٰہ نحمدہٗ و نستعینہٗ ونستغفرہٗ و نؤمن بہ ونتوکل علیہ ونعوذ باللّٰہ من شرور انفسنا ومن سیئات اعمالنا من یھدہ اللّٰہ فلا مضل لہ ومن یضللہ فلا ھادی لہ ونشھد ان لا الٰہ الا اللّٰہ وحدہ لا شریك لہ ونشھد انّ سیدنا ومولانا محمدًا عبدہ ورسولہ صلی اللّٰہ تعالیٰ علیہ وعلیٰ اٰلہ واصحابہ و بارك وسلم **اما بعد:**

فاعوذ باللّٰہ من الشیطن الرجیم

بسم اللّٰہ الرحمن الرحیم

فقد قال النبی صلی اللّٰہ علیہ وسلم (اِنَّ لِرَبِّکُمۡ فِیۡ دَھۡرِکُمۡ نَفَحَاتٌ اَلا فَتَعُرَّضُوۡا لَہٗ وفی نسخہ لھا رواہ الطبرانی)

''تمہارے رب کے لئے ساعات دہر میں نغمات ہیں''

تمہید

اس وقت ضرورت وعظ صرف یہ ہے کہ بعض مہمانوں کی درخواست ہے جو اتفاقاً آگئے ہیں اور اب ان کے جانے کا وقت قریب ہے اور مطلق ضرورت ہوتو ہر قسم کے بیان سے پوری ہوسکتی تھی۔ مگر جی یہ چاہا کہ بیان وقت ضرورت کا ہو یا دائمی ضرورت کا ہو[۱]۔ اور اس قسم کا کوئی خاص مضمون ذہن میں نہ تھا۔ کل اتفاق سے مثنوی پاس رکھی تھی جی چاہا کہ اسی سے کوئی مضمون بیان کردوں یا کم از کم اُسی

(۱) وعظ ایسا ہونا چاہیے جس کی اس وقت ضرورت ہو یا ایسے مضامین بیان کئے جائیں جن کی ہر وقت ضرورت ہو۔

کے اشعار پڑھ کر ان کی شرح کردوں۔ کیونکہ وہ معتبر کتاب ہے جس کے مضامین شرح کے موافق ہیں۔ اکثر تو صراحتًا منقول کے مطابق ہیں یا کم از کم مسکوت عنہ ہیں۔ (۱) یہ خیال کر کے جو مثنوی کو کھولا تو اُس میں اس کا بیان نکلا جو دائمی ضرورت کا مضمون ہے۔ (۲) جیسا کہ عنقریب واضح ہوجائے گا۔

تجلی کا معنی

یہ طبرانی کی روایت ہے۔ ترجمہ اس کا یہ ہے کہ تمہارے رب کے لئے ساعات (۳) دہر میں نفحات (۴) ہیں جس سے مراد تجلیات و فیوض و برکات ہیں۔ جن کو تشبیہاً (۵) نفحات سے تعبیر کیا گیا ہے۔ جس کے اصل معنی لغت میں خوشبو کی مہک کے ہیں وجہ تشبیہ یہ ہے کہ جس طرح خوشبو کی مہک منتشر ومتفرق ہوتی ہے (۶) اسی طرح حق تعالیٰ کی تجلی و فیوض کے آثار بھی منبسط ومتفرق ہوتے ہیں (۷)۔ مگر تجلی کا لفظ مبہم ہے (۸) اس کا مفہوم ایسا نہیں جس کو عام طور پر لوگ سمجھ لیں۔ بلکہ بعض دفعہ خلاف مقصود کی طرف ذہن پہنچ جاتا ہے جس کی وجہ یہ ہے کہ لوگوں کی نظر لُغت پر بھی کم ہے اور اصطلاحات پر بھی، بلکہ اصطلاح پر تو بہت ہی کم نظر ہے۔

عام طور پر تجلی کے لفظ سے معنی عُرفی اور وہ بھی عُرف عام کی طرف نظر پہنچتی ہے جس سے غلطی میں پڑجاتے ہیں۔ تجلی کے معنی لغۃً ظہور ہیں۔ جو ایک اعتبار سے صفت ہے اور ایک اعتبار سے فعل ہے۔ اور افعال کا ظہور فاعل کا ظہور

(۱) مثنوی کے اکثر مضامین تو ایسے ہیں جو قرآن وحدیث میں مذکور ہیں۔ یا وہ مضامین ہیں جن کے بارے میں قرآن وحدیث میں کوئی حکم منقول نہیں (۲) ایسا مضمون ہے جس کی ہر وقت ضرورت ہے (۳) زمانے میں مخصوص اوقات (۴) مہک (۵) اللہ کی تجلیات فیوض وبرکات کو نفحات یعنی خوشبو کی مہک سے تشبیہ دی گئی (۶) اِدھر اُدھر پھیل جاتی ہے (۷) اللہ کے فیوض و برکات بھی ہر طرف پھیلتے اور عام ہوتے ہیں (۸) لفظ تجلی میں کچھ خفاء ہے۔

ہے۔ اس معنی کو ظہور سے تعبیر کرنا موہم خلاف مقصود نہیں۔ (۱)

اور یہی معنی فَلَمَّا تَجَلّٰی رَبُّہٗ ''پس جب اس کے رب نے تجلی فرمائی'' میں مراد ہیں۔ مگر عرف عام میں تجلی کے معنی نظر آنے کے مشہور ہیں۔ جس سے آیت میں اشکال واقع ہوتا ہے کہ تَجَلّٰی رَبُّہٗ سے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ موسیٰ علیہ السلام کو حق تعالیٰ کی تجلی ہوئی (۲) اور اس سے پہلے لَنْ تَرَانِیْ میں رویت کی نفی ہو چکی ہے (۳)۔ مگر تجلی بمعنی ظہور سے یہ اشکال وارد نہیں ہوتا (۴) کیونکہ لَنْ تَرَانِیْ سے تجلی بمعنی رویت کی نفی تھی نہ کہ تجلی بمعنی ظہور کی۔

اشکال کا جواب

البتہ ایک اشکال باقی رہے گا وہ یہ کہ لَمَّا تَجَلّٰی رَبُّہٗ شرط ہے وَخَرَّ مُوْسٰی صَعِقًا (اور حضرت موسیٰ علیہ السلام گر کر بیہوش ہو گئے) مع اپنے معطوف علیہ کے جزا ہے اور شرط و جزا میں تقدم و تاخر لازم ہے۔ تو معلوم ہوا کہ ظہور کے بعد موسیٰ علیہ السلام بے ہوش ہوئے اور بے ہوشی ہی مانع رؤیت تھی تو لازم ہے کہ بے ہوشی کے قبل رؤیت ہوگئی (۵) اور اشکال عود کر آیا۔

اس کا جواب یہ ہے کہ شرط و جزا میں تقدم و تاخر تو ضروری ہے مگر وہ عام ہے کہ ذاتی ہو یا زمانی صحت مجازاۃ کے لئے احدھما کافی ہے (۶) زمانی ہی ضروری نہیں اور نہ یہاں اس پر کوئی دلیل قائم ہے پس ہم کہتے ہیں کہ یہاں تقدم و تاخر محض ذاتی ہے اور وقوع دونوں کا ایک زمانہ میں ساتھ ساتھ ہوا۔ تجلی کا بھی اور صعق کا بھی۔

(۱) افعال کے ظہور سے فاعل کا ظہور مراد لینے سے مقصود کے خلاف کا وہم نہیں ہوتا (۲) اللہ تعالیٰ دکھائی دیئے (۳) اس پہلی آیت لن ترانی سے معلوم ہوتا ہے کہ رویت باری نہیں ہوسکتی (۴) اگر تجلی کو ظہور کے معنی میں لیں تو اس پر یہ اشکال نہیں ہوتا (۵) بے ہوش ہونے سے پہلے دیکھ لیا تو اشکال برقرار رہا (۶) دونوں میں سے کسی ایک کا پایا جانا کافی ہے۔

پس اب تقدم و تاخر سے وقوع رویت لازم میں آتا(۱)۔ البتہ اگر تجلی کے بعد کچھ زمانہ صعق میں فصل ہوتا(۲) تو اشکال ہوتا لیکن اس پر کوئی دلیل نہیں اس لئے اشکال رفع ہوگیا۔

بہر حال تجلی کے معنیٰ یہ نہیں کہ کوئی چیز نظر آئے بلکہ اس کے معنی مطلق انکشاف وظہور کے ہیں خواہ ایک طرف سے ہو یا دونوں طرف سے۔ مگر چونکہ تجلی کے لفظ میں رویت کا ابہام ہوسکتا ہے(۳) اس لئے میں نفحات کے ترجمہ میں اس کو ترک کرتا ہوں (۴) اور گو ظہور وانکشاف میں اس درجہ کا اہتمام نہیں مگر کسی قدر ایہام کا احتمال اس میں بھی ہے کیونکہ عرفاً انکشاف وظہور سے بھی متبادل وہی ظہور وانکشاف شئے کا ہے۔ جو بلا واسطہ ہو اور ظہور بواسطہ افعال وصفات کو عام لوگ ظہور کم سمجھے ہیں۔ اس لئے میں اس کو بھی ترک کرتا ہوں (۵) اور نفحات کے ترجمہ میں توجہ کا لفظ (۶) اختیار کرتا ہوں۔

اصطلاحات فن تصوف

اس فن کے اخلاق (۷) کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ اس کی اصطلاحات پر لوگوں کی نظر نہیں اور ایک لطیفہ یہ ہے کہ بدوں باقاعدہ حاصل کئے اس فن کی اصطلاحات پر نظر دشوار بھی ہے (۸) کیونکہ اس فن میں جو اصطلاحات ہیں وہ مختلف فنون کی اصطلاحات سے مخلوط ہیں (۹) کہیں لغت کو لے لیا ہے کہیں اصطلاح اہل منطق کو کہیں اصطلاح فلاسفہ کو کہیں اصطلاحات اہلِ کلام کو اور بعض جگہ عرفِ عام کو۔

(۱) جب ظہور تجلی اور بے ہوش ہوکر گرنا ایک ساتھ واقع ہوئے تو دیکھنا ثابت نہ ہوا (۲) اگر ظہور تجلی اور پیچھے گر جانے میں کچھ زمانے کا فرق ہوتا تو اشکال ہوسکتا تھا اور اس پر کوئی دلیل نہیں ہے (۳) خدا کو دیکھنے کا وہم ہوسکتا ہے (۴) اس لئے نفحات کا ترجمہ تجلی نہیں کرتا (۵) اس لئے نفحات کا ترجمہ ظہور بھی نہیں کرتا (۶) نفحات کا ترجمہ توجہ کرتا ہوں (۷) اس فن کی پوشیدگی کی ایک وجہ یہ ہے (۸) فن تصوف کو باقاعدہ سیکھے بغیر اس کی اصطلاحات سے واقف ہونا مشکل ہے (۹) ملی جلی ہیں۔

اور اس کی وجہ عجب نہیں کہ یہ ہو کہ یہ حضرات اپنے علوم کا اخفاء چاہتے ہیں (۱)۔ چنانچہ ان کے لئے خاص خاص اصطلاحات کا ہونا تو مولانا کے کلام سے معلوم ہوتا ہے اصطلاحاتیست مرابدال را (۲) اور قصداً اخفا حافظ کے قول سے معلوم ہوتا ہے۔

با مدعی مگوئید اسرار عشق ومستی بگذار تابمیر در رنج خود پرستی (۳)

اس کا جواب یہ ہے تاکہ نااہلوں کا جو کہ ان اسرار کے متحمل نہیں۔ ایمان محفوظ رہے۔ چنانچہ مولانا فرماتے ہیں:

پیش ایں الماس بے اسپر میا کز بریدن تیغ رانبود حیا (۴)

تدوین تصوف کی وجہ

اب یہ سوال ہوگا کہ جب اخفاء مقصود ہے تو ان علوم کی تدوین کیوں کی گئی۔ اس کا جواب یہ ہے تاکہ اہل ان کو دیکھ کر اپنے احوال کو ان پر منطبق کر لے کیونکہ حالات و کیفیات اور ذوقیات کی مقبولیت کی علامت توافق مع السلف ہے جو ذوقیات و کیفیات سلف کے موافق نہ ہوں (۵) اُن کے قبول میں شبہ رہتا ہے۔ یہ وجہ ہے اس فن کے اخلاق کی۔ اس لئے عام لوگ اس کو نہیں سمجھتے اور وہ حضرات خود بھی اس کا قصد کرتے ہیں۔ اسی لئے میں نے تجلی کے لفظ کی جگہ تو توجہ اختیار کیا ہے۔ کیونکہ تجلی اصطلاحی لفظ ہے جس کے معنی عوام صحیح طور پر نہیں سمجھ سکتے۔ ورنہ اصل معنی اس کے ظہور ہیں، خواہ بواسطہ ہی ہو تو اس معنی پر کوئی اشکال نہیں ہے کیونکہ یہ معنی اصطلاح اور لغت دونوں کے موافق ہیں۔

---

(۱) اس کی وجہ غالبا یہ ہے کہ یہ لوگ اپنے علوم کو چھپانا چاہتے ہیں (۲) اس میں خاص اصطلاحاتیں ہیں (۳) ''عشق اور مستی کا راز مدعی سے نہ کہئے اسے چھوڑیئے تاکہ وہ اپنے خود پرستی کے رنج میں مرجائے'' (۴) ''اس ہتھیار کے سامنے بلا ڈھال کے نہ آ اس لئے کہ تلوار کو کاٹنے میں لحاظ شرم نہیں ہے'' (۵) کیفیات وحالات اگر سلف کے موافق ہیں تو مقبول ہیں ورنہ نہیں۔

حدیث کے معنی

اسی طرح لفظ صورت بھی اصطلاح میں بمعنی ظہور مستعمل ہے۔اور اس کے بعد حدیث (اِنَّ اللّٰہَ خَلَقَ اٰدَامَ عَلٰی صُوْرَتِہٖ) ''بے شک اللہ تعالیٰ نے انسان کو اپنی صورت پر پیدا کیا'' پر کچھ اشکال نہیں رہتا۔مگر اصطلاح کے نہ جاننے سے نہ معلوم لوگ اس کو کہاں سے کہاں لے گئے ہیں۔صاف مطلب یہ ہے کہ خدا تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کو اس طرح پیدا کیا کہ ان سے کمالات حق کا ظہور ہوتا ہے۔پس صورت حق سے مراد ظہور حق ہے اور اس میں انسان ہی کی خصوصیت نہیں بلکہ اس معنی کر (۱) تمام عالم صورت حق ہے یعنی مظہر حق۔کیونکہ مخلوق سے خالق کا ظہور ہوتا ہے۔افعال سے فاعل کا ظہور ہوتا ہے لیکن آدم کی تخصیص حدیث میں اس وجہ سے ہے کہ انسان سے بہ نسبت دوسری مخلوقات کے حق تعالیٰ کا ظہور اتم واکمل ہوتا ہے۔(۲) اب سب اشکالات رفع ہو گئے۔

توجہ حق تعالیٰ

خلاصہ یہ ہے کہ اگر صحیح اصطلاحات فن تصوف کی معلوم ہوں تو پھر اس میں کثرت سے اشکال نہیں ہوتا۔مگر لوگ صحیح اصطلاحات کو نہ تو جانتے ہیں نہ حاصل کرتے ہیں۔اس لئے اشکال واقع ہوتا ہے۔میں نے اسی واسطے ''توجہ'' کا عام فہم لفظ لے لیا ہے اور موہم لفظ چھوڑ دیا ہے۔تو حضور ﷺ فرماتے ہیں کہ ساعات دہر (۳) میں بعض ساعات ایسی ہیں جن میں حق تعالیٰ کی توجہ خاص ہوتی ہے۔

الا فتعرضوا الیہ خبردار ہو جاؤ کہ اس وقت تم بھی اللہ تعالیٰ کے سامنے پیش ہو جاؤ۔

(۱) اس معنی کے اعتبار سے تو تمام عالم صورت حق (۲) بکمال وتمام ظہور ہوتا ہے (۳) اوقات زمانہ۔

دوسری روایت میں فتعرضوا لھا ہے اس کا ترجمہ یہ ہوگا کہ تم بھی ان نفحات یعنی توجہات کے لئے مستعد رہا کرو۔ یعنی اپنے کو اس قابل بناؤ کہ وہ توجہات تم پر واقع ہوں۔ اور ان کی برکتیں تم کو حاصل ہوں۔ اس مضمون کا ضروری ہونا تو ظاہر ہے کیونکہ حق تعالیٰ کی توجہ کا طالب کون نہیں؟ ہر شخص اس کا طالب ہے۔ خواہ دین کے لئے یا دنیا کے لئے۔ کیونکہ جملہ خیر و کمال حق تعالیٰ کی توجہ کا ثمر ہے۔ کوئی نفع یا بھلائی خواہ دین کی ہو یا دنیا کی بدوں توجہ حق (۱) کے حاصل نہیں ہوسکتی۔ اس لئے ہر شخص خواہ دیندار ہو یا دنیادار۔ حق تعالیٰ کی توجہ کا طالب ضرور ہے۔ اسی سے مضمون کی ضرورت ظاہر ہے۔

طرز شارع علیہ السلام

اب یہاں ایک مسئلہ اور سمجھنا چاہئے وہ یہ کہ شارع علیہ السلام کو چونکہ کسی فن کا مدوّن (۲) کرنا مقصود نہیں۔ بلکہ اصل مقصود اصلاح ہے۔ اس لئے جن چیزوں کے بتلانے کی ضرورت نہ تھی ان کی تعلیم نہیں کی گئی۔ یہی وجہ ہے کہ حرمت خمر کی (۳) تو تعلیم فرمائی اور شرب خمر پر وعید بھی ہے (۴) مگر حرمت بول و غائط (۵) کا کہیں ذکر نہیں نہ اکل بول و براز پر کہیں وعید (۶) حالانکہ نجاست میں بول و براز خمر سے (۷) بڑھ کر ہے۔ کیونکہ خمر تو تخلیل سے منقلب الماہیۃ ہوکر طہارت کی طرف عود کرآتی (۸) ہے اور بول میں ایسا انقلاب بھی نہیں ہوتا (۹) تو اگر شارع

(۱) بغیر حق تعالیٰ کی توجہ کے (۲) کسی فن کو جمع کرنا مقصود نہیں بلکہ اصلاح مقصود ہے (۳) شراب کے حرام ہونے کو تو بتایا (۴) شراب پینے پر سزا کا بھی ذکر ہے (۵) پیشاب پاخانے کے حرام ہونے کا کہیں ذکر نہیں (۶) نہ پیشاب پاخانے کے کھانے پینے پر سزا کا ذکر ہے (۷) ناپاکی میں پیشاب پاخانہ شراب سے بڑھ کر ہے (۸) اس لئے کہ شراب کا اگر سرکہ بنالیا جائے تو اس کی ماہیت تبدیل ہونے کی بنا پر وہ پاک ہوجاتی ہے (۹) لیکن پیشاب میں ایسی تبدیلی بھی نہیں ہوتی۔

کو تدوین فن مقصود ہوتا تو نجاست خمر کے ساتھ نجاست بول و براز کا بھی اہتمام کے ساتھ بیان (۱) ہوتا مگر چونکہ اس سے عام وطرح پر سب کو کراہت ہے اور کوئی ان کے کھانے پینے کو گوارا نہیں کرتا۔ نہ اپنے بدن پر ان کا لگا رہنا گوارا کرتا ہے۔ اس لئے شارع نے ان کی نجاست وحرمت کا زیادہ اہتمام نہیں کیا۔

شریعت میں بعض احکام مذکور نہ ہونے کی وجہ

اسی طرح اگر کسی چیز کی ضرورت بدیہی ہو تو اس کے بیان کا بھی اہتمام نہیں فرمایا۔ چنانچہ والدین کی حرمت تافیف کا تو ذکر فرمایا مگر ان کے ضرب وشتم کی حرمت کا ذکر نہیں (۲) فرمایا کہ بدیہی تھی۔

اسی طرح اگر اس کا معلوم کرنا ضروری نہ ہو تو اُس کو بھی نہیں بتلایا۔ چنانچہ اسی بناء پر درجہ تفصیل میں تقدیر کے مسئلہ کو بیان نہیں فرمایا یعنی اس مسئلہ میں دو درجہ تھے ایک اجمال کا ایک تفصیل کا اور تفصیل غیر ضروری تھی تو شارع نے اس کی تفصیل نہیں کی اور کاوش (۳) سے منع فرمایا کیونکہ تقدیر تجویز حق کا نام ہے جس کا تعلق ذات وصفات حق سے ہے۔ اس میں کاوش کرنے سے بجز حیرت وپریشانی کے کچھ حاصل نہ ہوگا اور درجہ اجمال میں چونکہ اس کا بیان ضروری تھا اس وجہ سے اجمالاً بیان فرمادیا ہے۔ اور اسی ضرورت کی بناء پر اُسی مسئلہ کی ایک ایسی غایت بھی بتلادی جس کی ضرورت عاجلہ تھی۔ یعنی اعتقاد تقدیر کی ایک غایت تو عاجلہ یعنی اجر آخرت کیونکہ اس کا اعتقاد موجب نجات ہے۔ یہ خاصیت ہے عقائد حقہ میں کہ بدوں عمل کے وہ خود بھی موجب نجات ہیں۔ گو نجات اولیٰ (۴) نہ ہو۔

---

(۱) پس اگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو فن کو مدون کرنا مقصود ہوتا تو شراب کی ناپاکی کے ساتھ پیشاب وغیرہ کی ناپاکی کو بھی اسی اہتمام سے بیان کیا جاتا (۲) والدین کو اُف تک کہنے کو تو منع کیا لیکن ان کو گالی دینے اور مارنے کی ممانعت نہیں کی کیونکہ اس کی ممانعت تو ظاہر ہے (۳) جستجو (۴) اگرچہ ابتداءً نجات نہ ہو سزا بھگت کر ہی نجات ہو جائے۔

اعتقادِ تقدیر کا فائدہ

سو شارع نے اسی پر اکتفاء نہیں کیا۔ بلکہ اس کے ساتھ ایک غایت عاجلہ بھی بتلا دی۔ چنانچہ ارشاد ہے: ﴿مَآ اَصَابَ مِنْ مُّصِيْبَةٍ فِي الْاَرْضِ وَلَا فِيْٓ اَنْفُسِكُمْ اِلَّا فِيْ كِتٰبٍ مِّنْ قَبْلِ اَنْ نَّبْرَاَهَا ط الی قولہ تعالیٰ لِّكَيْلَا تَاْسَوْا عَلٰى مَا فَاتَكُمْ وَلَا تَفْرَحُوْا بِمَآ اٰتٰىكُمْ ﴾(۱) لِّكَيْلَا تَاْسَوْا یہاں محذوف ہے ای اخبرنا بذٰلك لكيلا تأسوا۔

یعنی حق تعالیٰ مسئلہ تقدیر کو بیان کر کے فرماتے ہیں کہ ہم نے تم کو اس لئے خبر کی ہے تا کہ جو چیز تم سے فوت ہو جائے اور اس پر تم کو رنج نہ ہو اور جو کچھ تم کو دیا ہے۔ اس پر اتراؤ نہیں۔ اس تعلیم کی قدر و عظمت ظہور نتائج کے وقت ہوگی۔ اور یہی کیا؟ شریعت کی قدر موقع پر معلوم ہوتی ہے ورنہ ظاہر میں تو وہ بہت سرسری و معمولی باتیں معلوم ہوتی ہیں جن کو ایک عام آدمی بھی سمجھ لیتا ہے۔ تعلیم شرعی کوئی پیچیدہ اور دشوار(۲) چیز نہیں جس کے سمجھنے کے لئے معقول و فلسفہ کی اصطلاحات جاننا ضروری ہو مگر ظہور نتائج کے وقت معلوم ہوتا ہے کہ یہ سہل سہل(۳) باتیں کتنی قیمتی ہیں اور ظہور بھی وہ معتبر ہے جو واقعات میں ہوتا ہے۔

چنانچہ یہی مسئلہ تقدیر ظاہراً تو ایک معمولی بات ہے کہ جو کچھ ہوتا ہے سب پہلے سے تجویز ہو چکا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ نے پہلے سے سب لکھ دیا ہے اب واقعات میں اس کا اثر دیکھنا چاہئے۔ مثلاً دو ایسے شخص لئے جائیں جن کے لائق فائق بیٹوں کا علاج کی غلطی سے انتقال ہو گیا ہو اور اُن میں سے ایک تو تقدیر کا قائل ہے۔ دوسرا منکر ہے منکرِ تقدیر کی تو یہ حالت ہوگی کہ وہ بار بار حسرت کرے گا کہ طبیب یا

(۱) الحدید:۲۲۔۲۳ (۲) مشکل (۳) آسان آسان باتیں۔

ڈاکٹر سے تشخیص میں غلطی ہوگئی۔ اور علاج میں کوتاہی ہوگئی۔ اگر فلاں شخص سے علاج کرایا جاتا تو ضرور بچ جاتا یا فلاں دوا دی جاتی تو یہ ہلاک نہ ہوتا اور دوسرا شخص جو قائل تقدیر ہے۔ ممکن ہے کہ طبعی طور پر کبھی اُس کو بھی طبیب یا طریقہ علاج کی غلطی کا خیال ہو مگر وہ پھر یہ سمجھے گا کہ یہ غلطی تو لازم تھی۔ خدا تعالیٰ نے اس کے لئے اتنی ہی عمر لکھی تھی۔ یہی وقت اس کی موت کے لئے مقدر تھا۔ اس واسطے اُس کا سامان پیدا ہونا ضروری تھا۔

چوں قضا آید طبیب ابلہ شود ''جب موت آتی ہے تو طبیب نادان بن جاتا ہے''۔

اور اس وقت جو بھی دوا دی جاتی وہ نفع کے بجائے نقصان ہی کرتی۔ تو اس شخص کو طبیب وغیرہ کی غلطی سے حسرت نہ ہوگی(۱)۔ کہ ہائے یوں ہوتا تو ضرور اچھا ہوجاتا۔ بلکہ تقدیر کے اعتقاد سے بہت جلد سکون ہوجائے گا کہ یوں ہونا تو ضروری ہی تھا۔ اور دوسرے کی حسرت کبھی ختم نہ ہوگی۔ وہ ہمیشہ اسی خیال میں رہے گا کہ ہائے اگر یوں ہوتا تو ضرور نفع ہوتا۔ تبدیلی آب و ہوا کی جاتی تو ضرور مریض بچ جاتا۔ اسی اگر مگر میں اس کا دل ہمیشہ کڑھتا ہی رہے گا۔ اسی کے متعلق حدیث میں ہے۔ (اِیَّاکُمْ وَاللَّوْ فَاِنَّھَا مطیئۃ الشیطان) ''بچو! تم اگر مگر سے کیونکہ وہ شیطان کی سواری ہے''۔

اس میں مطلق لَو کی ممانعت نہیں بلکہ اُسی لو کی ممانعت ہے جو واقعات ماضیہ میں بطور حسرت کے استعمال کیا جاتا ہے۔ لو کان کذا لکان کذا ۔ کہ اگر یوں کیا جاتا تو یہ نتیجہ ہوتا۔ ارے احمق! جب وہ قصہ رفت و گزشت ہوا(۲)۔ تو اب اسکے متعلق اس اگر مگر سے فائدہ کیا۔ تمہاری اگر مگر سے مُردہ زندہ ہوجائے گا۔ ہرگز نہیں بس

(۱) افسوس نہ ہوگا (۲) جب وہ قصہ گیا گذرا ہوگیا۔

سوائے اس کے کہ شیطان اس طریقہ سے پریشان کرنا چاہتا ہے۔ اور کچھ نہیں۔

رنج طبعی کا فائدہ

طبعی رنج تو واقعات سے قائل تقدیر کو بھی ہوتا ہے اور ہونا چاہئے اس میں بہت سی حکمتیں ہیں۔ مثلاً اخلاق کے درست کرنے میں رنج وغم کو بہت دخل ہے اس سے نفس کی اصلاح ایک بڑے درجہ میں بخوبی ہوتی ہے۔ نیز آخرت کی طرف توجہ بڑھ جاتی ہے اور دُنیا سے دل مکدر ہوجاتا ہے۔ انہی حکمتوں کی وجہ سے کاملین کو بھی ایسے واقعات سے رنج ہوتا ہے۔ مگر عقلی رنج نہیں ہوتا۔

حزن وغم کے درجات

اور رنج کی اس طبعی وعقلی تقسیم سے ایک بڑا اشکال رفع ہوگیا وہ یہ کہ حق تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کے قصہ میں ان کی والدہ کو خطاب فرمایا ہے۔ وَلَا تَخَافِيْ وَلَا تَحْزَنِيْ ''اور تو خوف نہ کر اور نہ غم کر'' اشکال یہ ہے کہ خوف وحزن اختیاری ہے یا غیر اختیاری۔ شق اول تو مشاہدہ کے خلاف ہے۔ مشاہدہ یہ بتلاتا ہے کہ رنج وہ واقعات سے طبعی طور پر رنج ضرور ہوتا ہے۔ وہ بندہ کے اختیار سے باہر ہے پس شق ثانی متعین ہوگئی یعنی خوف وحزن غیر اختیاری ہے پس اب اشکال یہ ہے کہ جب یہ غیر اختیاری امر ہے تو پھر اس سے نہی کیوں ہے کیونکہ امر ونہی کا تعلق امور اختیاریہ سے ہوتا ہے نہ کہ غیر اختیاریہ سے۔

اس کا جواب میرے نزدیک یہ ہے کہ خوف وحزن کے دو درجے ہیں۔ ایک غیر اختیاری یہ خوف وحزن طبعی ہے اور ایک اختیاری یہ خوف وحزن عقلی ہے۔ مثلاً طبعی حزن تو یہ ہے کہ ایک واقعہ رنج دہ ہوا اور دل پر اُس سے چوٹ لگی بے قراری ہوئی اور عقلی درجہ یہ ہے کہ اس غم کو لے کر بیٹھ جائے اس میں غور وفکر کرتا

رہے۔ قصداً اُس کو یاد کرتا رہے۔ زبان سے تذکرہ کرتا رہے اس طرح جو شخص غم کو لے کر بیٹھے گا تو غم پہلے سے زیادہ ہوگا۔ تو وَلَا تَخَافِيْ وَلَا تَحْزَنِيْ ’’اور تو خوف نہ کر اور نہ غم کر‘‘ میں طبعی حزن کی ممانعت نہیں جو غیر اختیاری ہے بلکہ عقلی حزن کی ممانعت ہے جو اختیار سے پیدا ہوتا ہے اور گو حزن طبعی کا حدوث (۱) غیر اختیاری ہے مگر تدبیر و علاج سے اس میں تقلیل ہوسکتی ہے (۲) اور علاج یہ ہے کہ طبیعت کو دوسری چیز کی طرف متوجہ کرے یہ عام قاعدہ ہے کہ دوسری چیز کی طرف متوجہ ہونے سے پہلی چیز کمزور ہو جاتی ہے اور بعض امور کو تو بعض کے ازالہ یا تضعیف (۳) میں خاص دخل ہوتا ہے مثلاً غم کی حالت میں بشارت کو یاد کرنا ازالہ غم میں بہت مفید (۴) ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے اولاً تو عقلی حزن و خوف کے ازالہ کی یہ تدبیر فرمائی (۵) کہ

﴿اِنَّا رَآدُّوْهُ اِلَيْكِ وَجَاعِلُوْهُ مِنَ الْمُرْسَلِيْنَ﴾ ’’بے شک ہم اسے تجھے واپس کر دیں گے اور اسے اپنے وقت پر رسول بنا دیں گے‘‘ کی بشارت سنائی۔ اس میں مصیبت فراق کی غایت وحد (۶) بھی بتلادی کہ یہ ایک دن ختم ہونے والی ہے۔ اور اُس کے ساتھ ایک بشارت عظمیٰ بھی سنادی کہ ہم موسیٰ علیہ السلام کو رسول بنانے والے ہیں تو یہ مصیبت مرتفع ہو کر ایک نفع زائد حاصل ہوگا بہرحال تقدیر کا اجمالی درجہ تو نہایت ضروری تھا دین کے اعتبار سے بھی اور دنیا کے اعتبار سے بھی۔ واقعی بدوں اعتقاد تقدیر کے مصائب و حوادث میں سکون قلب ہرگز حاصل نہیں ہوسکتا۔ اس لئے شارع نے اجمالاً اس کو بیان فرمایا اور اس کے منافع سے بھی مطلع فرمایا۔

(۱) طبعی غم ہونا غیر اختیاری ہے (۲) علاج سے اس میں کمی ہوسکتی ہے (۳) زائل کرنے اور کمزور کرنے میں خاص دخل ہے (۴) غم کے موقع پر خوشی و مسرت کی بات یاد کرنے سے غم میں کمی ہوتی ہے (۵) عقلی غم و خوف اختیار کرنے کی ممانعت فرمائی پھر طبعی غم و خوف کے کم کرنے کا طریقہ بتایا (۶) اس جدائی کی غرض و غایت اور حد بھی بتادی۔

مسئلہ تقدیر میں تفصیلی بحث مباحثہ کی ممانعت

لیکن درجۂ تفصیل (۱) میں اس کے بیان کی ضرورت نہ تھی تو اس سے شارع نے تعرض فرمایا۔ بلکہ اس سے منع فرمادیا چنانچہ ایک بار صحابہؓ اس مسئلہ میں گفتگو کررہے تھے کیونکہ اُس وقت تک اُن کو اس کی حد معلوم نہیں تھی کہ کس حد تک اس کے علم کی ضرورت ہے اور اس کے آگے ضرورت نہیں کیونکہ حدود تو اُن کو بتلانے ہی سے معلوم ہوئے اور یہ یقینی ہے کہ صحابہؓ کی غرض اس گفتگو سے تعنت (۲) یا ارتکاب معاصی کے لئے عذر تراشنا نہ تھی (۳) ۔محض تحقیق (۴) مقصود تھی کہ اسی درمیان میں رسول اللہ ﷺ تشریف لے آئے اور آپ ﷺ نے سختی کے ساتھ اس مسئلہ میں گفتگو کرنے سے ممانعت فرمائی اور یہ بھی فرمایا کہ اس میں جو گفتگو کرے گا۔ اُس سے آخرت میں پوچھ ہوگی۔ اور اس پر ایک سوال ہے وہ یہ کہ پوچھ تو ہر چیز سے ہوگی۔ چنانچہ نص ہے۔﴿ فَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَّرَهٗ وَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا يَّرَهٗ﴾ ''جو شخص دنیا میں ذرہ برابر نیکی کرے گا وہ وہاں دیکھ لے گا اور جو شخص ذرہ برابر برائی کرے گا وہ وہاں دیکھ لے گا''۔

پھر اس ارشاد سے کہ آخرت میں کلام فی التقدیر (۵) کی پوچھ ہوگی۔ کوئی خاص وعید ثابت نہ ہوئی۔ حالانکہ حضور ﷺ کا یہ ارشاد بطور وعید (۶) کے تھا۔ اس کے جواب میں ہمارے اساتذہ نے یہ فرمایا ہے کہ حضور ﷺ کا مطلب یہ ہے کہ آخرت میں کلام فی التقدیر کے متعلق یہ پوچھ ہوگی کہ ہاں صاحب تم مسئلہ تقدیر کے بڑے محقق تھے۔ ذرا ہمارے سامنے تو بیان کرو۔ یہ بہت ہی لطیف (۷) معنیٰ

(۱) اس کو مفصل بیان کرنے کی ضرورت نہیں تھی (۲) عیب جوئی (۳) گناہ کرنے کے لئے عذر گھڑنا نہیں تھا (۴) صرف تحقیق مقصود تھی (۵) تقدیر کے بارے میں گفتگو کرنے پر پوچھ ہوگی (۶) تنبیہ وڈانٹ ڈپٹ (۷) عمدہ۔

ہیں۔ اور اب اس کا خاص وعید ہونا معلوم ہوگیا۔ گویا حضور ﷺ نے بتلا دیا کہ جو کوئی مسئلہ تقدیر میں زیادہ گفتگو کرنا چاہتا ہے وہ اس کے لئے تیار رہے کہ حق تعالیٰ کے سامنے بھی اس کو بیان کر سکے اور یقیناً اس مسئلہ میں ہم کچھ بھی تحقیقات بیان کریں گے وہ اس قابل نہ ہوں گی کہ حق تعالیٰ کے سامنے بیان کر سکیں کیونکہ وہ محض تخمینیات وظنیات(۱) ہوں گے یقینیات(۲) نہ ہوں گی اور حق تعالیٰ کے سامنے یقینیات ہی کو بیان کر سکتے ہیں۔ نہ کہ تخمینیات کو۔ غرض شارع نے اس مسئلہ میں تفصیل سے اسی واسطے منع کر دیا ہے کہ اس کی تفصیل سے کوئی ضرورت متعلق نہ تھی۔ نہ دنیوی نہ دینی۔ دونوں ضرورتیں اعتقاد اجمالی سے رفع ہو سکتی ہیں۔ غرض شارع کا طرز یہ ہے کہ ضروری امور کا اہتمام فرماتے ہیں۔ غیر ضروری امور کا اہتمام نہیں فرماتے۔

جب یہ مسئلہ معلوم ہوگیا۔ اس کی بناء پر اس حدیث کے متعلق یہ سوال وارد ہوتا ہے کہ حق تعالیٰ کی توجہ ہر شخص کو مطلوب ہونے کے سبب مضمون حدیث کا ضروری ہے۔ جیسا بیان بھی ہو چکا۔ لیکن یہ ضرورت ہر شخص کو معلوم بھی ہے پھر قاعدہ مذکورہ کی بناء پر اس کے بیان کی کیا ضرورت رہی۔ پھر شارع نے اس کو کیوں بیان فرمایا تو اس کی وجہ یہ ہے کہ ہماری غفلت کی وجہ سے اس کو بیان فرمایا کہ یہ مضمون ضروری تو اس درجہ ہے اور ہم کو اس کی طرف توجہ نہ تھی۔ اب سوال نہ رہا۔

حصولِ توجہ

اب حدیث کے متعلق عرض کرتا ہوں۔ حدیث سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ

(۱) وہ صرف اندازے اور گمان کی حد کی باتیں ہوں گی (۲) یقینی اور تحقیقی۔

حق تعالیٰ بعض اوقات ہماری طرف ایک خاص طور سے متوجہ ہوتے ہیں جس کو نفحات سے تعبیر فرمایا ہے۔ تو ضرورت اس کی ہے کہ ہم بھی ان کی طرف متوجہ ہوں جس کا حاصل یہ ہے کہ تنہا اُدھر کی اس طرز کی توجہ پر کفایت مت کرو بلکہ کامیابی کے لئے تم بھی توجہ کرو۔ وہ توجہ اس طرز کی ہے جیسے ایک کریم سائل کی طرف دیکھ رہا ہو کہ یہ میری طرف نظر کرے تو میں اس کو روپیہ دیدوں۔ اب اگر کوئی سائل ایسا بددماغ ہو کہ باوجود کریم کی نظر کے بھی اُس کی طرف آنکھ اُٹھا کر نہ دیکھے تو بتلایئے اس کو روپیہ کیونکر مل جاوے گا۔ بلکہ اس کی نظر کے بعد اس کا نگاہ نہ اُٹھانا اور دوسری طرف متوجہ رہنا قاعدہ سے موجب عتاب وطرد ہوگا(۱)۔

ہاں ایک دوسری قسم کی توجہ یہ بھی ہے کہ کریم سائل کی نظر کا انتظار نہ کرے۔ بلکہ اس کی بے خبری میں روپیہ جیب میں ڈال دے۔ مگر اس توجہ کا کچھ قانون نہیں۔ بلکہ یہ وہب محض ہے۔(۲) قانون ہی ہے جو صورت اول میں مذکور ہوا کہ ان کی توجہ کے وقت تم بھی اُدھر متوجہ ہو تو دولت مل جائے گی۔ رہا وہب تو اس کے لئے کچھ ضابطہ نہیں چنانچہ نبوت امور وہبیہ میں سے ہے۔ جس کی حالت یہ ہے کہ انبیاء علیہم السلام کو جو نبوت عطاء ہوئی ہے تو اُن کو پہلے سے اس کا علم نہیں ہوا کہ میں نبی ہونے والا ہوں۔ گو آثار پہلے سے ظاہر ہونے لگتے ہیں۔ مگر یہ خبر بھی بعد ہی میں ہوتی ہے کہ یہ آثار مقدمۂ نبوت تھے۔

نیز کسی نبی سے یہ ثابت نہیں کہ انہوں نے اپنے لئے نبوت کی دعا کی ہو۔ ورنہ کہیں تو ثبوت ہوتا بلکہ حدیث میں تو اس کے خلاف آتا ہے کہ حضور ﷺ کو جب نبوت عطا ہوئی تو آپ حیرت زدہ ہوگئے۔ اس سے معلوم ہوا کہ آپ ﷺ کو نبوت دفعۃً مل گئی تھی۔ پہلے سے آپ ﷺ کو اس کا علم نہ تھا۔ کہ میں نبی ہونے والا ہوں۔

(۱) سزاء اور سرزنش کا باعث ہوگا (۲) خالص عطاء ہے۔

پھر اس عطاء کے بعد بھی آپ کو اجمالاً نبوت کا علم ہوا۔ باقی تفصیل اس وقت بھی مخفی رہی جس کا علم دوسرے ذرائع سے ہوا۔

حضور ﷺ کے ورقہ بن نوفل کے پاس جانے کی وجہ

چنانچہ روایات میں آتا ہے کہ حضرت خدیجہ الکبریٰ سے حضور ﷺ نے اس واقعہ کو حیرت واستعجاب کے ساتھ بیان فرمایا۔ تو وہ آپ ﷺ کو ورقہ بن نوفل کے پاس لے گئیں۔ سو اس کا تو وہم بھی جائز نہیں کہ آپ ﷺ کو عطائے نبوت کے بعد اپنے نبی ہونے میں کچھ شبہ رہا تھا۔ نعوذ باللہ! یہ تو محال ہے کیونکہ سب سے پہلے نبی پر اپنی نبوت پر ایمان لانا لازم ہے بلکہ منشا اس کا وہی تھا کہ حضور ﷺ کو نبوت کے آثار وعلامات کی تفصیلی اطلاع نہ تھی کیونکہ آپ ﷺ کے علوم سب وحی سے ماخوذ ہیں نہ کہ کتب سے تو اول وحی میں آپ ﷺ کو جملہ آثار وکیفیات کیسے معلوم ہوجاتے (۱)۔ اور ورقہ بن نوفل کتب سماویہ کے عالم تھے وہ کتابوں کے ذریعے سے آثار وعلاماتِ نبوت کی تفصیل معلوم کئے ہوئے تھے۔ اس لئے وہ حضور ﷺ کا واقعہ سن کر فوراً سمجھ گئے کہ آپ ﷺ کو نبوت عطا ہوئی ہے اور آپ ﷺ کی خدمت میں تفصیلی حالات عرض کئے۔ چنانچہ ان حالات میں یہ بھی عرض کیا کہ نبوت کے لئے قوم کا مخالفت کرنا۔ ایذاء پہنچانا ضروری ہے۔ مگر انجام کار نبی کو غلبہ ہوا کرتا ہے۔ اور یہ بھی عرض کیا: (يَالَيْتَنِيْ كُنْتُ فِيْهَا جَذَعًا يَا لَيْتَنِيْ اَكُوْنُ حَيًّا اِذْ يُخْرِجُكَ قَوْمُكَ قَالَ اَوَ مُخْرِجِيَّ هُمْ قَالَ نَعَمْ لَمْ يَأْتِ رَجُلٌ قَطُّ بِمِثْلِ مَا جِئْتَ بِهٖ اِلَّا عُوْدِيَ) ''کاش! میں آپ ﷺ کی ظہور نبوت کے وقت جوان ہوتا۔ کاش! میں اس وقت تک زندہ رہوں جب کہ آپ ﷺ کو آپ کی قوم (مکہ سے)

(۱) پہلی وحی میں ہی آپ کو نبوت کے تمام آثار وکیفیات کا کیسے علم ہوسکتا تھا۔

نکالے گی۔ حضور ﷺ نے پوچھا۔ کیا وہ مجھ کو نکالنے والے بھی ہیں۔ ورقہ نے کہا ہاں جو کوئی بھی نبوت سے ممتاز ہوتا ہے تو اُس کے ساتھ عداوت ضرور کی جاتی ہے۔

تو حضور ﷺ حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کے کہنے سے ورقہ کے پاس اس غرض سے چلے گئے تھے کہ یہ کتب سماویہ کے عالم ہونے کی وجہ سے آثار نبوت وحالات انبیاء کو زیادہ جانتے ہیں۔ ان سے کچھ معلومات زیادہ حاصل ہوں گی جو موجب زیادت طمانیت وسکون ہوں۔(۱)

ورقہ بن نوفل حضور ﷺ سے افضل نہیں تھے

مگر اس سے ورقہ کی فضیلت حضور ﷺ پر لازم نہیں آتی۔ نعوذ باللہ! کیونکہ ان کی تو بلاتشبیہ ایسی مثال ہے جیسے ایک شخص کو دفعۃً ڈپٹی کلکٹر بنادیا جائے اور وہ کسی قانون دان سے جو کسی عہدہ سے ممتاز نہیں۔ اس منصب کے لوازم ووظائف کی تحقیق کرے کہ فلاں کام کس طریقہ سے اور فلاں انتظام کس صورت سے کرنا چاہئے۔ مگر کیا محض اتنی بات سے وہ قانون داں درجہ میں اُس سے افضل ہوسکتا ہے۔ ہرگز نہیں۔ آپ نے سنا ہوگا کہ بعض دفعہ ایک بادشاہ کو نابالغی کی حالت میں گدی نشین کیا جاتا ہے اور وزیر کو اُس کا اتالیق بنایا جاتا ہے۔ بتلائیے درجہ میں کون افضل ہے یقیناً بادشاہ افضل ہے۔ گو اس وقت معلومات امور سلطنت میں وزیر اُس سے بڑھا ہوا ہے مگر وزیر نوکر ہے اور وہ نابالغ شہزادہ آقا ہے۔ بلاتشبیہ یہی مثال یہاں سمجھ لیجئے کہ حضور ﷺ کو اپنی نبوت کا تو پورا یقین وعلم تھا مگر اول وحی میں آپ ﷺ کو نبوت کے آثار ولوازم وکیفیات زیادہ معلوم نہ تھے۔ ورقہ کو کتب سماویہ کے مطالعہ سے یہ امور زیادہ معلوم تھے۔ اس لئے آپ ﷺ اُن سے ملنے گئے

(۱) جو اطمنان وسکون میں زیادتی کا باعث ہو جائیں۔

تا کہ عہدہ نبوت کے آثار ولوازم کا علم حاصل کر کے اطمینان وسکون زیادہ ہو جائے۔ بہر حال وہب کے لئے کوئی قاعدہ نہیں وہ دفعۃً ہوتا ہے۔ جس میں انسان کے کسب واختیار وعلم کو دخل نہیں ہوتا۔ پھر وہب کے بھروسہ پر رہنا غلطی ہے۔ حق تعالیٰ شانہٗ کی توجہ کا عام طریق سلوک (۱) ہی ہے اور جذب ووہب (۲) کا طریق عام نہیں اس کی ایسی مثال ہے جیسے حصول اولاد کا عام طریق نکاح اور زوجین کا ہمبستر ہونا اور کبھی ایسا بھی ہوا ہے کہ بدوں (۳) شوہر کے اولاد ہوگئی۔ جیسے مریم علیہا السلام اور عیسیٰ علیہ السلام پیدا ہوئے اور کبھی بدوں ماں باپ کے بھی تکون (۴) ہوا ہے۔ جیسے آدم علیہ السلام بدوں ماں باپ کے ہوئے۔ مگر یہ طریقے عام نہیں۔ ان کے بھروسہ پر بدوں نکاح کے اولاد کی تمنا میں رہنا غلطی ہے۔

جذب خاص ہے اور سلوک عام

سلوک کے عام اور وہب وجذب کے خاص ہونے کی تائید ایک آیت سے بھی ہوتی ہے ﴿اَللّٰہُ یَجْتَبِیْٓ اِلَیْہِ مَنْ یَّشَآءُ وَیَھْدِیْٓ اِلَیْہِ مَنْ یُّنِیْبُ﴾ ''اللہ اپنی طرف جس کو چاہے کھینچ لیتا ہے اور جو شخص اللہ کی طرف رجوع کرے اس کو اپنے تک رسائی دیتا ہے''۔

اجتباء بمعنی جذب ہے یہاں اصطلاح لغت کے موافق ہے یہاں حق تعالیٰ نے جذب کو تو اپنی مشیت (۵) پر رکھا ہے کہ جس کو ہم چاہتے ہیں اپنی طرف کھینچ لیتے ہیں وہ وعدہ عام نہیں فرمایا اور ہدایت کو انابت (۶) پر مرتب فرمایا ہے جو مرادف ہے سلوک کا۔ اور فعل ہے عبد کا (۷) حاصل یہ ہوا کہ جو شخص بھی حق تعالیٰ

(۱) اللہ تعالیٰ کی طرف خود چل کر جانا اور اس کی توجہ حاصل کرنے کی کوشش کرنا (۲) عطاء اور جذب عام نہیں (۳) بغیر شوہر (۴) بغیر ماں باپ کے بھی پیدائش ہوئی ہے (۵) جس کو اللہ چاہتے ہیں کھینچ لیتے ہیں (۶) جو متوجہ ہوتا ہے اس کو ہدایت عطا فرماتے ہیں (۷) بندے کا فعل ہے۔

کی طرف متوجہ ہوتا ہے۔ اور اپنے اختیار سے اعمال قُرب کو اختیار کرتا ہے۔ حق تعالیٰ اُس کو وصول الی المقصود[۱] سے کامیاب فرمادیتے ہیں اور یہ عام طریقہ ہے اس میں کسی کی خصوصیت نہیں۔

سلوک وجذب

یہاں یہ حقیقت سمجھنے کے قابل ہے کہ اس جگہ ہدایت سے مراد ایصال ہے[۲] جس سے معلوم ہوا کہ انابت سلوک پر ایصال ضرور مرتب ہوتا ہے اور ایصال کا حاصل بھی وہی ہے جو اجتبآء کا حاصل ہے[۳] صرف اتنا فرق ہے کہ اجتباء عمل سے مقدم ہے[۴] اور اُس میں عمل کو کچھ دخل نہیں اور ایصال عمل سے مؤخر ہے[۵] اس میں انابت وسلوک عبد کو بھی بظاہر کچھ دخل ہے تو معلوم ہوا کہ جذب ہی کی دو قسمیں ہیں ایک قبل العمل ایک بعد العمل[۶] مگر زیادہ وقوع جذب بعد العمل کا ہے عادۃ اللہ یہی ہے کہ سلوک یعنی عمل مقدم ہوتا ہے اور جذب مؤخر ہوتا ہے اور کبھی اس کا بھی وقوع ہوا ہے کہ عمل سے پہلے ہی جذب ہوگیا اور جذب کے بعد عمل مرتب ہوا سو اس جذب قبل العمل کے واقعات دیکھ کر یہ نہ سمجھنا چاہئے کہ سلوک وعمل بے کار ہے۔

عمل کا درجہ

ہاں یہ ضرور ہے کہ عمل علت تامہ وصول[۷] کی نہیں۔ بلکہ شرط اکثری ہے اس کی ایسی مثال ہے کہ کوئی یوں کہے کہ علاج کو صحت میں دخل نہیں۔ اگر اس کا

---

(۱) جو اپنے اختیار سے اعمال قرب اختیار کرتا ہے اس کو قرب عطا فرمادیتے ہیں (۲) مقصود تک پہنچادینا (۳) مقصود تک پہنچ جانا (۴) انتخاب عمل سے پہلے ہوتا ہے اس میں عمل کو دخل نہیں ہوتا (۵) اس میں مقصود عمل کے بعد حاصل ہوتا ہے عمل کا اس میں دخل ہے (۶) اللہ کے بندے کو اپنی طرف کھینچ لینے کی دوصورتیں ہیں ایک عمل سے پہلے ایک عمل کے بعد (۷) یہ نہیں ہے کہ عمل کرے تو وصول ضرور ہوجائے گا۔

یہ مطلب ہے کہ علت نہیں تو صحیح ہے کیونکہ صحت علاج کے بعد ضروری نہیں ممکن ہے کہ ایک شخص علاج کرے اور صحت نہ ہو اور اگر مطلق سببیت کی نفی مراد ہے تو غلط کیونکہ سببیت فی الجملہ مشاہد ہے (۱)۔ یہی حال اعمال کا ہے کہ ان کو وصول وقرب میں علیت کا تو دخل نہیں باقی سببیت کی نفی نہیں ہوسکتی۔ (۲)

یہی مطلب ہے حدیث کا (لَا یَدْخُلُ الْجَنَّۃَ اَحَدَ بِعملِہٖ) نہیں داخل ہوگا کوئی جنت میں عمل کے استحقاق کی بناء پر۔ کہ اس میں بھی علیت اعمال کی نفی ہے اور مقصود اس سے عجب کا علاج ہے (۳) کہ کوئی شخص عمل کر کے اترائے نہیں کہ میں نے اپنے عمل سے جنت لے لی کیونکہ اول تو عمل کے بعد بھی جذب کی ضرورت ہے اور جذب کا مدار مشیت حق پر ہے (۴)۔ سلوک کے بعد بھی وہی پہنچتا ہے جس کو حق تعالیٰ پہنچادیں۔ کیونکہ وصول عبد کے اختیار سے خارج ہے۔ اس کا مدار ایصال حق پر ہے۔ جو حق تعالیٰ کا فعل ہے اور گو سلوک پر ایصال کا ترتب عادۃً ضرور ہوتا ہے۔ (۵) مگر جو شئے عادۃً ضروری ہو اور عقلاً لازم نہ ہو اُس کو عمل کا معلول نہیں کہہ سکتے۔ اگر وہ عمل کا معلول ہوتا تو عقلاً بھی علت کے بعد اُس کا وجود لازم ہوتا (۶)۔ اور یہاں ایسا نہیں ورنہ فعل واجب کا معلل ہونا لازم آئے گا۔ اور یہ دلائل سے باطل ہے دوسرے علت ومعلول میں مناسبت بھی شرط ہے۔ جزاء عظیم کا ترتب عمل عظیم ہی پر ہوسکتا ہے۔ تو جس درجہ جزاء عظیم ہے عمل بھی اُسی درجہ عظیم ہونا چاہئے تو اب دیکھ لو کہ جنت کس درجہ عظیم ہے اور تمہارا عمل کیسا ہے۔ جنت تو

(۱) یہ کہنا کہ علاج صحت کا سبب بھی نہیں ہے تو یہ بات غلط ہے کیونکہ مشاہدہ ہے کہ اکثر علاج کرنے سے صحت ہوجاتی ہے (۲) علت نہیں ہیں سبب ہیں (۳) تکبر کا علاج (۴) عمل کے بعد بھی اللہ کے اس کی طرف متوجہ ہونے کی ضرورت ہے جس سے مقصود حاصل ہوگا اور وہ اللہ کے ارادے پر موقوف ہے (۵) جو اس طریق میں چلتا ہے عادۃً پہنچ جاتا ہے (۶) اگر عمل وصول کی علت ہوتا تو عمل کے بعد وصول کا پایا جانا ضروری ہوتا۔

کماً و کیفاً ہر طرح عظیم ہے کماً تو اس کی عظمت یہ ہے کہ غیر متناہی ہے اور کیفاً اُس کی یہ شان ہے کہ لَا خَطَرَ عَلٰی قَلْبِ بَشَرٍ (کسی انسان کے وہم و گمان میں بھی نہیں گزرا)۔

ہمارے اعمال کا حال

اور ہمارے اعمال کی یہ حالت ہے کہ کمّا(۱) تو متناہی ہیں اور کیفاً ناقص نماز ہے تو اُس میں توجہ نہیں۔ تعدیل ارکان نہیں۔ نسیان اور سہو(۲) کے ساتھ ادا کرتے ہیں۔ روزہ ہے تو اس میں غیبت شکایت ہے جھوٹ سے احتراز نہیں ذکر ہے تو اس میں خلوص نہیں۔ بزرگ بننے کا شوق ہے کیا اس حالت میں جنت کو عمل کا معلول کہا جاسکتا ہے کہ عمل سے جنت ملی ہرگز نہیں بلکہ یہ کہا جائے گا کہ عمل میں تو تاثیر نہ تھی محض فضل سے جنت مل گئی۔ مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ عمل بیکار ہے۔ ہرگز نہیں کیونکہ عادۃ اللہ یہی جاری ہے کہ حق تعالیٰ عمل کے بعد توجہ فرماتے ہیں چنانچہ ہمارا اُدھر متوجہ ہونا بھی ایک عمل ہے اور اگر بندہ کو توجہ وطلب نہ ہو تو اس کے متعلق صاف ارشاد ہے: (اَنُلْزِمُكُمُوْهَا وَاَنْتُمْ لَهَا كٰرِهُوْنَ) ''کیا تمہارے چپکا دوں درانحالیکہ تم اس کو مکروہ سمجھتے ہو''۔

بعض لوگوں پر رحمت خداوندی

کیا ہم اپنی رحمت کو تمہارے سر چپکا دیں گو اس کی طرف رغبت نہ ہو۔ بلکہ اُس سے کراہت ہو۔ ہاں کبھی بطور وہب کے ایسا بھی ہوا ہے کہ باوجود بندہ کی کراہت کے اس کے سر رحمت کو چپکا دیا گیا جس کا یہ اثر ہوا کہ اول اُس کو رغبت پیدا ہوئی پھر عمل کا صدور ہونے لگا۔ جیسا حدیث میں ہے۔(اِنَّ اللّٰـهَ

(۱) مقدار کے اعتبار سے تو تھوڑے ہیں ہی اور کیفیت کے اعتبار سے ناقص (۲) بھول چوک۔

يَضْحَكُ اِلٰى رِجَالٍ يَدْ خُلُوْنَ الْجَنَّةَ فِى السَّلَاسِلِ)اللہ تعالیٰ ایسے لوگوں کو دیکھ کر بہت خوش ہوتے ہیں جو بیڑیوں میں باندھ باندھ کر جنت کی طرف کھینچے جاتے ہیں۔

یہ وہ کفار ہیں جو مسلمانوں سے لڑنے آئے اور جنگ میں قید ہوگئے۔ پھر مسلمانوں کی صحبت سے ان کے قلب میں اسلام آ گیا اور مسلمان ہوکر جنت کے مالک ہوگئے۔ مگر یہ قاعدہ کلیہ نہیں۔ بلکہ ظاہر میں تو اسلام کا مقابلہ کرنا زیادہ طردولعن (۱) کا سبب ہے لیکن بطور وہب کے حق تعالیٰ کسی کے حق میں اس کو بواسطہ رحمت کا سبب بنادیتے ہیں۔ باقی اصل قاعدہ حصولِ رحمت کا یہی ہے کہ بندہ بھی حق تعالیٰ کی طرف متوجہ ہو۔ اسی واسطے رسول اللہ ﷺ فرماتے ہیں کہ حق تعالیٰ کی توجہات تمہاری طرف ہوتی رہتی ہیں تو تم بھی اُن سے غافل نہ رہو۔ بلکہ اُدھر متوجہ رہو جیسے سائل کریم کے ہاتھ کو تکتا رہتا ہے۔ تاکہ تم کو بھی دولت مل جائے۔

حق عظمت

صاحبو! اوّل تو اللہ تعالیٰ کا ہماری طرف متوجہ ہونا ایسا امر ہے کہ اگر اس کے بعد ہم کو اُدھر متوجہ ہونے کا حکم بھی نہ ہوتا تب بھی ہم کو خود متوجہ ہونا چاہئے تھا۔ کیونکہ حق تعالیٰ کی عظمت کا مقتضاء یہی ہے کہ ہم اُدھر متوجہ ہوں گو وہ ہماری طرف متوجہ بھی نہ ہوں۔ تب بھی اُن کی عظمت کا مقتضاء یہ ہے کہ ہم ہی اوّل ہی اوّل (۲) اُدھر متوجہ ہوں کیونکہ بعض حقوق تو احسان وانعام کی وجہ سے ہوتے ہیں اور بعض حقوق محض عظمت کی وجہ سے ہیں۔ صاحبو! حق تعالیٰ کی طرف متوجہ ہونا یہ اُن کی عظمت کا حق ہے۔ گو اُدھر سے کوئی احسان بھی نہ ہوتا۔ اس کو صوفیہ نے سمجھا ہے وہ اکثر اعمال میں حق عظمت ہی کا خیال رکھتے ہیں۔

(۱) دھتکارے جانے اور لعن وملامت کا سبب ہے (۲) ہم ہی پہلے اُدھر متوجہ ہوں۔

حق تفویض

چنانچہ تفویض وتسلیم (۱) کے متعلق محققین کا قول ہے کہ تفویض اس نیت سے اختیار نہ کرے کہ اس سے راحت ہوتی ہے بلکہ محض اس لئے اختیار کرے کہ یہ حق تعالیٰ کا حق عظمت ہے یعنی تم یہ سمجھ کر تفویض کرو کہ تم غلام ہو اور وہ آقا ہیں۔ اور آقا کا حق ہے کہ غلام اپنے سب امور اُس کو مفوض کردے (۲)۔ اُس میں کسی اور مصلحت ومنفعت کا خیال نہ کرو پھر وہ مصالح و منافع بھی خود بخود حاصل ہوجائیں گے کیونکہ وہ تو تفویض کے ساتھ لگے ہوئے ہیں۔ لیکن اداء حق عظمت کے ارادہ کے ساتھ وہ منافع مع ثواب ورضاء کے حاصل ہوں گے اور اس کے بغیر گو منافع مرتب ہوں مگر اُس میں رضاء قرب زیادہ نہ ہوگا۔

حق تواضع

اسی طرح تواضع کے باب میں فرماتے ہیں کہ تم یہ سمجھ کر تواضع اختیار کرو کہ حق تعالیٰ کی عظمت کا حق یہی ہے کہ اُن کے سامنے ہر شخص پستی اور تواضع کو اپنی صفت بنائے اور اپنے آپ کو لاشئ محض سمجھے اس پر حق تعالیٰ کا وعدہ ہے کہ جو اس طرح تواضع اختیار کرے گا۔ ہم اُس کو رفعت عطا کریں گے۔ لیکن تم رفعت (۳) کی نیت سے تواضع اختیار نہ کرو۔ گو ایک طرح کی رفعت اس طرح بھی حاصل ہوجائے گی۔ کیونکہ تواضع میں خاصیت ہے گو کسی نیت سے ہو کہ وہ قلوب کو کشش کرتی ہے۔ مگر اس صورت میں حقیقی رفعت یعنی قرب ورضاء حق حاصل نہ ہوگی۔

---

(۱) اپنے کو اللہ کے سپرد کردینا اور ہر حال میں سر تسلیم خم کرنا (۲) اس کے سپرد کردے (۳) بلندی حاصل کرنے کی نیت سے۔

حق تعالیٰ کی صفات کا مقتضی

اسی طرح مسئلہ زیر بحث میں حق تعالیٰ کے صفات وکمالات خود ایسے ہیں کہ اُن کا کمال اس کو مقتضی ہے کہ اُن کی طرف توجہ کی جائے اوران کی یاد دل میں بسائی جائے اورحق تعالیٰ کے کمالات کا مقتضاء یہ کیوں نہ ہو جب کہ ہم ادنیٰ ادنیٰ مثالوں میں اس کا مشاہدہ کرتے ہیں۔ کہ کمال فی نفسہٖ توجہ کو مقتضی ہوتا ہے(۱)۔ دیکھئے اگر ایک خوبصورت پھول ہو جس کے ہاتھ آنے کی بھی اُمید نہ ہو کیونکہ وہ ایسے شخص کے باغ میں لگا ہوا ہے جس نے پھول توڑنے کی ممانعت کر رکھی ہے مگر جب اس پر نظر پڑتی ہے تو وہ اپنی خوبصورتی سے آپ کے دل کو اپنی طرف کشش کرتا ہے کہ مجھے دیکھو ایسی ہی کوئی عمدہ عمارت بنی ہوئی ہو جس پر آپ کی ملک قائم ہونے کے بعید سے بعید احتمال (۲) بھی نہیں مگر محض اُس کی عمدگی کی وجہ سے لوگ اس کی سیر کو جاتے ہیں کوئی ان سے پوچھے کہ اُسے دیکھ کر تم کو کیا مل جائے گا۔ مگر پھر بھی لوگ اس کی سیر کرتے ہیں۔ آخر وہ کیا چیز ہے جس کی وجہ سے تاج بی بی کا روضہ دیکھنے کا عام طور پر سب کو اشتیاق ہے۔ بجز اس کے اور کوئی سبب نہیں ہوسکتا۔ کہ اس کا کمال ہی سیر کو مقتضی ہے (۳)۔ اور اُس کی خوبصورتی ہر شخص کے قلب کو اپنی طرف کھینچتی ہے۔ یا کوئی حسین جمیل آدمی ہو تو خواہ مخواہ ہر شخص کا دل اُسے دیکھنے کو چاہتا ہے۔ غرض جو چیز بھی کامل ہے اُس کے کمال کا اقتضاء یہ ہے کہ وہ اپنی طرف دل کو کشش کرتی ہے اور توجہ کو مقتضی ہے۔

توجہ کے درجات

اب یہ الگ بات ہے کہ توجہ مفید ہے تو جائز ہے۔ ورنہ ناجائز ہے۔ جیسے نظر الی غیر المحارم ونظر الی الامارد (۴)۔ اسی طرح کسی کے مال کو حسرت

(۱) اپنی ذات کے اعتبار سے توجہ کو چاہتا ہے (۲) دور کا احتمال بھی نہ ہو (۳) اس کی خوبصورتی کی بنا پر ہی اس کو دیکھنے کا تقاضا ہوتا ہے (۴) نامحرم اور نابالغ بچوں کو شہوت کی نظر سے دیکھنا۔

سے تکنا وغیرہ۔ ان توجہات سے شریعت نے منع فرمایا ہے: ﴿ قُلْ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ يَغُضُّوْا مِنْ اَبْصَارِهِمْ وَيَحْفَظُوْا فُرُوْجَهُمْ ....وَقُلْ لِّلْمُؤْمِنٰتِ يَغْضُضْنَ مِنْ اَبْصَارِهِنَّ وَيَحْفَظْنَ فُرُوْجَهُنَّ ﴾(۱)

﴿ وَلَا تَمُدَّنَّ عَيْنَيْكَ اِلٰى مَامَتَّعْنَا بِهٖٓ اَزْوَاجًا مِّنْهُمْ زَهْرَةَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا لِنَفْتِنَهُمْ فِيْهِ ﴾(۲)

مگر اس نہی سے اُس خاصیت اقتضاء للتوجہ کی نفی نہیں ہوتی (۳)۔ اگر کوئی یہ کہے کہ مجھے تو حسین صورت دیکھ کر انجذ اب (۴) نہیں ہوتا۔ بلکہ مجھے وہ اور ایک حبشی دونوں مساوی (۵) لگتے ہیں تو یہ اس شخص کی بے حسی کی دلیل ہے حس صحیح کو حسین صورت کی طرف ضرور انجذ اب ہوگا لیکن وہ حکم شرعی کی وجہ سے نظر کو نیچی رکھے گا۔

حق تعالیٰ کے کمال کا مقتضی

اب سمجھئے کہ جب ادنیٰ مخلوق کا کمال کہ یقیناً ناقص ہے توجہ کو مقتضی ہے تو حق تعالیٰ کے کمالات کی کیا شان ہونا چاہئے جن کے متعلق صوفیہ تو یہ کہتے ہیں کہ حق تعالیٰ کے سوا کسی میں کچھ کمال ہے ہی نہیں۔ اور اگر کسی میں کچھ کمال نظر آتا ہے تو وہ بالذات (۶) نہیں بلکہ بالعرض ہے۔ جیسے ضوء شمس (۷) کہ زمین سے اس کا تعلق بالعرض ورنہ دراصل ضوء صفت شمس ہے (۸) اور زمین سے صرف عطا کا تعلق ہے۔

پھر بعضے صوفیہ تو یہ کہتے ہیں کہ جتنے بھی کمالات ہیں وہ سب فی نفسہٖ حق تعالیٰ

(۱) ''اے رسول اکرم ﷺ آپ مسلمان مردوں سے کہہ دیجئے کہ اپنی آنکھوں کو نیچے رکھیں اور اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کریں...... اور اسی طرح آپ صلی اللہ علیہ وسلم مسلمان عورتوں سے فرمادیں کہ وہ اپنی نگاہیں نیچی رکھیں اور اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کریں'' سورۃ النور: ۳۰۔۳۱ (۲) ''اور ہرگز اُن چیزوں کی طرف آپ آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھئے جن سے ہم نے کفار کے مختلف گروہوں کو اُن کی آزمائش کے لئے متمتع کر رکھا ہے کہ وہ دنیوی زندگی کی رونق ہے'' سورۃ طٰہٰ: ۱۳۱ (۳) اسکی طرف متوجہ ہونے کے تقاضے کی نفی نہیں ہوتی (۴) حسین صورت مجھے اپنی طرف نہیں کھینچتی (۵) برابر (۶) وہ کمال اس کا ذاتی نہیں (۷) سورج کی روشنی (۸) زمین سے اس کا تعلق عارضی ہے ورنہ روشنی تو سورج کی صفت ہے۔

ہی کے کمالات ہیں اور مخلوق کے ساتھ اُن کو ویسا تعلق ہے جیسا جالس فی السفینہ (۱) کے ساتھ حرکت کا تعلق ہے۔ ظاہر ہے کہ جالس سفینہ خود متحرک نہیں۔ بلکہ سفینہ متحرک ہے بلکہ اس کی طرف حرکت کرنا بالعرض منسوب کر دیتے ہیں۔

اسی طرح مخلوق کی طرف کمالات کی نسبت بالعرض ہے۔ ورنہ یہ سب کمالات بالذات حق تعالیٰ کے کمالات ہیں اور بعض صوفیہ کہتے ہیں کہ مخلوق میں بھی اوصاف کمال ہیں۔ مگر وہ حق تعالیٰ کے عطا کردہ ہیں اور کمالات حق کے سامنے وہ اس درجہ ضعیف ہیں کہ اُن کے سامنے ان کو کمال کہنا بھی دشوار ہے (۲) پہلا قول وحدۃ الوجود کی طرف راجح ہے (۳) اور دوسرا قول وحدۃ الشہود کی طرف (۴)۔ غرض حق تعالیٰ کے کمالات ایسے ہیں کہ یا تو اُن کے سوا کسی میں کمال ہی نہیں یا اگر ہے تو ضعیف ولاشئے ہے (۵)۔ جب حق تعالیٰ اس درجہ کامل ہیں تو کیا اُن کا حق عظمت یہ نہ ہوگا۔ اُن کی طرف توجہ کی جائے۔

عارفین کے متوجہ الی اللہ ہونے کی حقیقت

چنانچہ عارفین محققین جو حق تعالیٰ کی طرف متوجہ ہوتے ہیں تو اس توجہ میں ان کو بجز ادائے حق عظمت کے اور کوئی قصد نہیں ہوتا۔ یہ مطلب نہیں کہ وہ حضرات اغراض سے مستغنی ہیں بلکہ مطلب یہ ہے کہ اغراض کی طرف التفات نہیں۔ باقی استغناء تو ایک دعویٰ ہے اور صوفیہ دعوے سے بالکل ہی بری ہیں۔ اور اگر کسی کے کلام میں جنت و دوزخ سے بے پروائی ظاہر ہوتی ہے تو اس سے مراد بے التفاتی ہے نا کہ دعویٰ استغناء اور کسی کے کلام میں دعویٰ ہی ہو تو وہ غلبۂ حال پر محمول ہے۔ بحر حال صوفیہ کا مذاق یہ ہے کہ وہ محض حق عظمت کے ادا کے نیت کرتے ہیں اور توجہ

(۱) جو شخص کشتی میں بیٹھا ہو تو اس کو بھی حرکت ہو رہی ہے لیکن وہ اس کی ذاتی نہیں ہے بلکہ کشتی متحرک ہے اس لئے وہ بھی متحرک ہے (۲) مشکل (۳) پہلے قول سے وحدت الوجود مراد ہے (۴) دوسرے قول سے وحدت الشہود (۵) کمزور اور نہ ہونے کے برابر ہے۔

الی الحق کے وقت کسی عرض پر التفات نہیں کرتے۔ نہ ثمرات کے طالب ہوتے ہیں۔ حتی کے وہ اس پر بھی راضی ہیں۔ کہ عمل پر کچھ ثمرہ نہ ملے۔

مذاقِ عشاق

ان حضرات کی اور دوسرے عابدوں کی ایسی مثال ہے جیسے ایک حسین جمیل محبوب نے دعوت کی ہو لوگ یہ سمجھ کر چلے کہ دعوت بھی کھائیں گے اور اس کی صورت بھی دیکھیں گے۔ پھر سب کے مجتمع ہونے کے بعد وہ یہ کہہ دے کہ دعوت نہیں محض جلوہ ہے تو شکم پرور تو یہ سن کر لوٹ آئیں گے اور عشاق ہرگز نہ ٹلیں گے کیونکہ وہ تو محض جلوہ ہی کے مشتاق ہیں۔ وہ محبوب کو دیکھ کر پھر کسی چیز کی طرف التفات نہیں کرتے۔ عشاق کا تو مذاق یہ ہے کہ اگر ان کو یقیناً معلوم ہوجائے کہ ہم جنت میں نہ جائیں گے جب بھی وہ عمل میں کوتاہی نہ کریں گے اور یوں کہیں گے۔

ملنے کا اور نہ ملنے کا مختار آپ ہے پر تجھ کو چاہئے کہ تگ و دو لگی رہے

اسی سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ محض حق عظمت ادا کرتے ہیں اور طالب ذات ہیں وہ ثمرات کے لئے عمل نہیں کرتے۔ بلکہ یہ سمجھ کر کرتے ہیں کہ ذاتِ حق کے کمالات کا اقتضاء یہی ہے کہ ان کی طرف متوجہ رہا جائے۔(۱)

درجاتِ توجہ

آگے اس توجہ کے چند درجے ہیں۔ ایک توجہ الی الصفات اور ایک توجہ الی الذات توجہ الی الصفات کہ سمیع، علیم، بصیر کا تصور کیا جائے جیسا کہ مشائخ بعض کو اَلَمْ یَعْلَمْ بِاَنَّ اللّٰہَ یَرٰی ''کیا اس شخص کو یہ خبر نہیں کہ اللہ تعالیٰ اس کو دیکھ رہا ہے'' کا مراقبہ بتلایا کرتے ہیں اور توجہ الی الذات یہ ہے کہ محض ذات کا تصور ہو کہ اس وقت صفات پر بھی نظر نہ ہو۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ اُن کو تصور بالکل نہ ہوتا ہے یہ تو محال ہے۔

(۱) اللہ کی عظمت کا تقاضا یہ ہے کہ اس کی طرف متوجہ رہا جائے

عنقا شکار کس نشود دام باز چیں کایں جا ہمیشہ باد بدست است دام را(۱)

بلکہ جس کو بھی ہوتا ہے۔ تصور وجہ کا ہوتا ہے۔ مگر وہ وجہ کو مرآۃ ذات (۲) کا بناتا ہے۔ اور ملتفت الیہ خود ذات ہوتی ہے بس یہی توجہ الی الذات ہے اور ایسے تصور کے لئے کنہ کا علم شرط نہیں اور یہ ممکن بھی ہے۔ آخر اتنی بات کا تو ہر شخص حکم کرتا ہے کہ اللہ تعالیٰ موجود ہیں اور تمام کائنات کے وہی خالق ہیں اور ظاہر ہے کہ اس حکم کے وقت تصور موضوع کا ضروری ہے۔ پس یہی درجہ تصور کا توجہ الی الذات کا کافی ہے۔ بس اسی موجود کی طرف ذہن کو متوجہ کرلو۔ یہی سرسری التفات (۳) کافی ہے اور اگر اس سے زیادہ بھی کچھ ہوا تو وہ بھی ناقص ہی ہوگا کیونکہ حق تعالیٰ وراء الوراء (۴) ہیں۔ وہ تمہارے تمام تصورات سے پاک ہیں۔

کل ما خطر ببالك فهو هالك والله اجل من ذٰلك (۵)

پھر اس تصور میں بھی درجات غیر متناہی ہیں (۶)۔ ہر شخص کا تصور الگ ہے اور دوسرا اُس سے بھی آگے پہنچا ہوا ہے۔

اے برادر بے نہایت در گہیست ہر چہ بروے میرسی بروے مأیست (۷)

مگر ان میں سے تصور کامل کسی کا نہیں۔ بلکہ سب کا تصور ناقص ہی ہے۔

نفع مراقبہ

رہا یہ کہ جب سب کا تصور ناقص ہے تو صوفیہ کو مراقبات سے کیا نفع ہوا۔ تصور ناقص تو عوام کو بھی حاصل ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ مراقبات کا نفع یہ نہیں ہے کہ ان سے تصور کامل ہوتا ہے۔ بلکہ یہ نفع ہے کہ ان سے تصور ناقص راسخ ہوجاتا ہے (۸)۔ اور اسی رسوخ میں مشائخ عوام سے ممتاز ہیں۔ سو عوام سے ہم کو یہ شکایت

(۱) ''جال اٹھائے عنقا کسی کے جال میں نہیں پھنستا کہ اس جگہ ہمیشہ جال میں ہوا کے سوا کچھ نہیں آتا'' (۲) ذات کا آئینہ (۳) معمولی توجہ (۴) سوچ تصور سے بھی باہر ہیں (۵) تمہارے دل میں جو صورت آتی ہے وہ مٹ جانے والی ہے اللہ تعالیٰ ان سب سے بلند و برتر ہے (۶) درجات کی کوئی انتہائی نہیں (۷) ''بھائی صاحب اس کی درگاہ کے اختتام کی کوئی انتہا نہیں ہے۔ جس منزل پر تیری رسائی ہو اُسی پر قناعت کر'' (۸) تصور دل میں جم جاتا ہے۔

نہیں کہ اُن کو تصورِ حق کامل طور پر کیوں نہیں ہے۔ بلکہ شکایت اس کی ہے کہ یہ تصور ناقص راسخ کیوں نہیں ہے۔ کہ کسی وقت تو خدا تعالیٰ کی یاد ہے اور کسی وقت غفلت ہے اور رسوخ ذکر کا اعلیٰ درجہ یہ ہے کہ ذات بحث کا تصور راسخ ہو جائے (۱) اور یہ پیدا ہوتا ہے کثرتِ ذکر سے مع تصور ذات بحت (۲) کے۔

ذکر اسم ذات

اور اگر ذکر میں بھی صرف اسم ذات (۳) کا ذکر اختیار کیا جاوے تو اہلِ طریق کے تجربہ سے یہ اُس تصور کا زیادہ معین ہوتا ہے۔ جس کو بعض علماء بدعت کہتے ہیں۔

چنانچہ علامہ ابن تیمیہ نے بھی ایک رسالہ میں ذکر اسم ذات کو بدعت لکھا ہے اور اُن کے مقابلہ میں بعض بے علم صوفیہ نے اس کو ثابت بالقرآن اور ثابت بالسنۃ کہہ دیا ہے۔ چنانچہ بعض نے قرآن سے اس ذکر کو ثابت کیا ہے۔ اور وہ دلائل ایسے کمزور ہیں کہ اُن کو ہم خود بھی رد کر دیتے ہیں۔ ابن تیمیہ تو کیوں رد نہ کرتے وہ تو بڑے محتاط ہیں۔ متشدد کا لفظ نہ کہوں گا۔ کیونکہ خلافِ ادب ہے چنانچہ بعض صوفیہ نے اس کو ﴿قُلِ اللّٰهُ ثُمَّ ذَرْهُمْ فِيْ خَوْضِهِمْ يَلْعَبُوْنَ﴾ (۴) سے ثابت کیا ہے کہ دیکھو اس میں حکم ہے کہ اللہ کہو نہ مبتداء ہے نہ خبر ہے بس صرف اللہ۔ کہنے کا امر ہے اُن سے کوئی پوچھے کہ پھر اَللّٰہُ کو نصب کیوں نہ ہوا رفع کیوں ہے۔

اوّل اس کے سباق کو دیکھو پھر سبق پورا ہوگا۔ اوپر ایک آیت میں ذکر ہے مقولہ کفار کا وہ آیت یہ ہے ﴿وَمَا قَدَرُوا اللّٰهَ حَقَّ قَدْرِهٖٓ اِذْ قَالُوْا مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ عَلٰى بَشَرٍ مِّنْ شَيْءٍ﴾ (۵) وہ کہتے تھے کہ خدا نے بشر پر وحی کبھی نازل نہیں کی۔ حق تعالیٰ اس

(۱) خالص ذات حق کا تصور راسخ ہو جائے (۲) خالص اللہ کی ذات کا تصور (۳) لفظ اللہ کا ذکر (۴) ''آپ صلی اللہ علیہ وسلم فرما دیجئے کہ اللہ تعالیٰ نے نازل فرمایا ہے پھر ان کو ان کے مشغلہ میں بیہودگی کے ساتھ لگا رہنے دیجئے'' (۵) ''ان لوگوں پر جیسا اللہ کی قدر پہچاننا واجب تھی ویسی قدر نہ پہچانی جبکہ یوں کہہ دیا کہ اللہ تعالیٰ نے کسی بشر پر کوئی چیز نازل نہیں کی''۔

کا جواب دیتے ہیں: ﴿قُلْ مَنْ اَنْزَلَ الْكِتٰبَ الَّذِيْ جَآءَ بِهٖ مُوْسٰى نُوْرًا وَّهُدًى لِّلنَّاسِ تَجْعَلُوْنَهٗ قَرَاطِيْسَ تُبْدُوْنَهَا وَتُخْفُوْنَ كَثِيْرًا ۚ وَعُلِّمْتُمْ مَّا لَمْ تَعْلَمُوْٓا اَنْتُمْ وَلَآ اٰبَآؤُكُمْ﴾(۱)

جواب کا حاصل یہ ہے کہ اگر انسان پر خدا نے کچھ نازل نہیں کیا تو بتلاؤ وہ کتاب کس نے نازل کی تھی جو موسیٰ علیہ السلام لائے تھے۔ جس میں لوگوں کے لئے نور وہدایت ہے۔ یہ جواب اس لئے دیا گیا کہ ﴿مَا اَنْزَلَ اللّٰهُ عَلٰى بَشَرٍ مِّنْ شَيْءٍ﴾(۲) کہنے میں یہود بھی مشرکین کے ہمنوا ہو گئے تھے۔ حالانکہ دونوں کا مسلک جُدا جُدا تھا۔ مگر مسلمانوں کے مقابلہ کے لئے دونوں متحد ہو گئے تھے۔ گویا کچھ دنوں کو ہندو مسلم کا سا اتحاد ہو گیا تھا۔

ہندو مسلم اتحاد کا انجام

مگر اس کا اثر یہ پڑتا ہے کہ صاحب حق صاحب باطل میں مدغم ہو جاتا ہے۔ صاحب باطل اہل حق میں مدغم نہیں ہوتا۔ اور اس کا راز یہ ہے کہ حق دشوار ہے کیونکہ نفس کے خلاف ہے۔ اور باطل سہل(۳) ہے اس لئے کہ وہ نفس کے موافق ہے اور اتفاق اس طرح ہوتا ہے کہ ایک اپنے مسلک کو کسی قدر چھوڑے تو صاحب باطل سہل کو چھوڑ کر دشوار کو کیوں اختیار کرے۔ اس لئے اتحاد کا یہی انجام ہوتا ہے کہ صاحب حق کو کسی قدر اپنا مسلک چھوڑنا پڑتا ہے چنانچہ یہاں بھی اتحاد ہندو مسلم کا یہی انجام ہوا تھا کہ کفار تو اپنے مذہب سے ذرا بھی نہ ہٹے اور مسلمان اتحاد کی خاطر کہیں سے کہیں پہنچ گئے اور یہی انجام یہود ومشرکین کے اتحاد کا ہوا کہ یہود بعض ایسے اقوال میں مشرکین کے ہمنوا ہو گئے

(۱) ”آپ ﷺ فرما دیجئے کہ وہ کتاب کس نے نازل کی ہے جس کو موسیٰ علیہ السلام لائے تھے کہ وہ نور ہے اور لوگوں کے لئے ہدایت ہے جس کو تم نے متفرق اوراق میں چھوڑا ہے جن کو ظاہر کر دیتے ہو اور بہت سی باتوں کو چھپاتے ہو اور تم کو بہت سی باتیں تعلیم کی گئی ہیں نہ تم جانتے تھے نہ تمہارے باپ دادا“ (سورۃ الانعام: ۹۱)
(۲) ”اللہ تعالیٰ نے کسی بشر پر کوئی چیز نازل نہیں کی“ (۳) آسان۔

جو خود ان کے مذہب کے بھی خلاف بلکہ اُن کے مذہب کی بنیاد منہدم کرنے والے تھے۔ جیسے یہی دعویٰ کہ حق تعالیٰ نے بشر پر کبھی کچھ نازل نہیں کیا جس سے لازم آتا ہے کہ توراۃ بھی خدا کی نازل کی ہوئی کتاب نہیں۔ حق تعالیٰ نے یہود سے یہی سوال کیا ہے کہ ہاں ذرا یہ تو بتلاؤ کہ توراۃ کو موسیٰ علیہ السلام پر کس نے نازل کیا ہے؟ یہ سوال قائم کر کے پھر خود ہی جواب دیتے ہیں قُلِ اللّٰہُ ای قُلْ اَنْزَلَہُ اللّٰہُ ۔یعنی کہہ دیجئے کہ خدا ہی نے اس کو نازل کیا۔ اب سیاق پر نظر کر کے اُن بے علم صوفیہ کے قول کو دیکھا جائے جو اس کے معنی یہ کرتے ہیں کہ اللہ اللہ کہو۔

تفسیر قرآن میں قواعد عربیت کا لحاظ ضروری ہے

دوسرے یہ کہ تفسیر قرآن میں قواعد عربیہ ہرگز متروک نہیں ہوسکتے اور قاعدہ عربیہ یہ ہے کہ قول کا مفعول جملہ ہوتا ہے جس کو مقولہ کہتے ہیں۔ مفرد نہیں ہوسکتا۔ اس لئے لامحالہ قُلْ کا مقولہ صرف لفظ اللہ نہیں ہوسکتا۔ بلکہ اس کے لئے مبتداء یا خبر یا فعل مقدر ماننا پڑے گا۔ اگر قواعد عربیہ کا لحاظ نہ کیا جائے تو پھر ہر شخص جو چاہے قرآن کی تفسیر کردیگا۔ جیسے ایک جاہل نے کہا تھا کہ مَنْ ذَالَّذِیْ یَشْفَعُ عِنْدَہٗ کے معنی یہ ہیں من ذل جس نے ذلیل کیا ذل کو بمعنی اذل لیا۔ اول تو یہی حماقت ۔ آگے فرماتے ہیں ذی اس نفس کو یشف وہ شفا پائے گا۔ کوئی پوچھے کہ فا کو فتح کیوں ہوا اور اس کے معنی شفا پائے گا کدھر سے ہوئے۔ بلکہ یشف بکسر فاء کے معنی ''تو شفا دے گا'' ہیں۔ اس کے بعد کہتے ہیں ''ع'' اس کو یاد رکھو اس احمق سے کوئی پوچھے کہ ''ع'' میں عین کو ضمہ کیوں ہوا یاد رکھنے کے معنی ہیں۔ وعی یعی آتا ہے۔ جس سے امر کا صیغہ ''ع'' بکسر العین ہے۔(۱)

(۱) ایک جاہل نے قرآن کریم کی آیت کی جو جاہلانہ تفسیر کی اس کو بیان فرما رہے ہیں کہ اس آیت مذکورہ میں اس نے کہا کہ من ذل ایک لفظ ہے جس کا مطلب ہے جس نے ذلیل کیا الذی میں سے لام چونکہ پہلے لفظ کے ساتھ ملا دیا تو باقی بچا ذی اس سے مراد نفس ہے مطلب ہے کہ نفس کو ذلیل کیا اس کے بعد اس نے یشفع کو بھی الگ الگ کر کے کہا یشف وہ یعنی اس کا نفس شفا پائے گا۔ پھر باقی بچا حرف عین تو کہتا ہے اس کو یاد رکھو یعنی عین کا ترجمہ کیا یاد رکھنا۔ اس لفظ کو ماخوذ مانا ''وعی یعی'' سے اور اس سے امر کا صیغہ ''ع'' بنے گا بالکل مہمل تفسیر ہے۔

مگر شاید قے کرنا چاہتا ہے۔ اس لئے ع ع کہا۔ (۱)

اب یہ کوئی تفسیر ہے ہرگز نہیں۔ بلکہ صریح تحریف ہے جو قواعد عربیہ اور رسم خط کے بالکل خلاف ہے۔ مگر جہلاء میں یہ باتیں رموز میں شمار ہوتی ہیں۔ جیسے ایک فقیر نے ماموں صاحب سے کہا تھا کہ بتلاؤ رزق بڑا یا محمد۔ انہوں نے کہا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بڑے ہیں کیونکہ آپ اوّل کائنات ہیں تو کہا بے پیرا معلوم ہوتا ہے۔ پھر دھتکار کر سر گھما کر کہا دیکو۔

اَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّداً رَّسُوْلُ اللّٰه ۔ اَنْ پہلے آیا محمد پیچھے آیا۔ اور اَنْ کہتے ہیں ہندی میں اناج کو۔ تو رزق کا رتبہ بڑا ہوا۔

اسی طرح ایک فقیر نے وَالضُّحٰی کی تفسیر کی تھی۔ وَاللَّیْلِ اِذَا سَجٰی ۔ اے نفس تیری یہی سجا (سزا) تو ایسے ایسے استدلالات واقعی لغو ہیں۔ ابن تیمیہ اگر رد نہ کرتے تو کیا کرتے۔

ذکر اسم ذات کا منشاء

مگر محققین صوفیہ اس کا اصل صحیح منشاء بتلا سکتے ہیں۔ وہ اسم ذات کے ذکر کو ذکر مسنون اور ثابت بالقرآن نہیں کہتے۔ بلکہ اس کے اختیار کا منشاء یہ ہے کہ اصل مقصود اس ذکر سے اس کے مدلول کا رسوخ فی القب (۲) ہے۔ اور قاعدہ ہے کہ رسوخ کے لئے تکرار مؤثر ہوتا ہے۔ اور اس کے لئے تجربہ کافی ہے۔ نقل ضروری نہیں۔ یعنی یہ ضروری نہیں کہ رسوخ کے ذریعے جو طریقہ اختیار کیا جائے وہ طریقہ سنت سے ثابت ہو۔ مثلاً میں نے آج نماز فجر کے بعد ایک شخص کو تلاوت کرتے ہوئے سنا وہ اِذَا السَّمَاءُ انْفَطَرَتْ (جب آسمان پھٹ جائے گا، پھٹ جائے گا، پھٹ جائے گا) پڑھ رہا تھا۔ طاء اپنے مخرج سے صاف نہ نکلی تو وہ فطرت فطرت کو مکرر کہہ رہا تھا۔ اب میں پوچھتا ہوں کیا اس کا فَطَرَتْ فَطَرَتْ کہنا بدعت تھا۔ اگر

(۱) جیسے الٹی کرنے وقت آدمی کے حلق سے عاعا کی آوازیں نکلتی ہیں (۲) ذات باری کا دل میں جم جانا ہے۔

یہ بدعت ہے تو دنیا سے حفظ قرآن اور تجوید قرآن کا علم ہی اُٹھ جائے گا اور ان دونوں کی تحصیل غیر ممکن ہو جائے گی۔ کیونکہ حفظ کے لئے بعض دفعہ ایک کلمہ کا تکرار ضروری ہوتا ہے۔ بلکہ بعض دفعہ جزوکلمہ کو تکرار کیا جاتا ہے۔ اب اگر ان کو اسی پر مجبور کیا جائے کہ پوری آیت کا تکرار کیا کرو۔ ایک کلمہ یا جزوکلمہ کو مکرر کیا کرو تو حفظ اور تجوید دشوار ہو جائیں گے۔ یا ان سب کو تکرار کلمہ و جز کلمہ سے گنہگار کہنا پڑے گا۔ ہم نہیں کہہ سکتے کہ ابن تیمیہ ایسے غیر محقق ہیں کہ جو فَطَرَتُ فَطَرَتُ کے تکرار کو بھی حرام کہیں گے۔ ہاں یہ مسلّم ہے اس صورت میں فَطَرَتُ کا تکرار تلاوت قرآن میں داخل نہ ہوگا۔ مگر تھیؤ للتلاوۃ(۱) میں تو ضرور داخل ہے۔

حضرات صحابہ رضی اللہ عنہم اور ذکر

ہاں یہ سوال کہ صحابہؓ سے رسوخ کے لئے یہ ذکر اللہ اللہ کیوں ثابت نہیں۔

اس کا جواب یہ ہے کہ صحابہ سے فَطَرَتُ فَطَرَتُ (پھٹ جائیگا پھٹ جائیگا) کہنا بھی کہاں ثابت ہے۔ تو کیا عدم ثبوت کی وجہ سے تم اس کو حرام کہہ دوگے اور جب یہ حرام نہیں تو عدم ثبوت کی بناء پر اللہ اللہ کو بدعت کیوں کہا جاتا ہے۔ بات یہ ہے کہ صحابی کی استعداد کامل تھی۔ ان کو لَآ اِلٰـهَ اِلَّا اللّٰهُ ہی میں توجہ کامل ہو جاتی تھی۔ اس لئے وہ اختصار کے محتاج نہ تھے۔ اور ہماری توجہ بدوں ایک ایک کلمہ کے تکرار کے کامل نہیں ہوتی۔ جیسے بعض لوگ تو پوری آیت کا اعادہ کر کے اُس کو یاد کر لیتے ہیں۔ اُن کو ایک ایک کلمہ کے تکرار کی ضرورت نہیں ہوتی۔ اور بعض لوگ پوری آیت کے تکرار سے حفظ نہیں کر سکتے۔ اُن کو ایک ایک بلکہ بعض دفعہ جزوکلمہ کے اعادہ کی حاجت ہوتی ہے۔ اور یہ بالاتفاق جائز ہے چنانچہ حفاظ کا عموماً اسی پر عمل ہے اور کسی نے آج تک اس کو حرام یا گناہ یا بدعت نہیں کہا۔ حالانکہ صحابہ سے یہ صورت بھی کہیں ثابت نہیں۔ پھر اگر ذکر اللہ اللہ کو اسی غرض سے اختیار کیا جائے تو وہ بدعت وحرام کیوں

(۱) لیکن تلاوت کی تیاری میں اس کو ضرور دخل ہے۔

ہوجائے گا۔ ہاں ایک بات البتہ لازم آئی وہ یہ کہ اس صورت میں اللہ اللہ کہنا ذکر نہ ہوا۔ جیسے فَطَرَتْ فَطَرَتْ کہنا تلاوت نہیں۔سو یہ ہم کو مسلّم ہے۔ بے شک یہ ذکر نہیں مگر بحکم ذکر ضرور ہے کیونکہ یہ تھیؤ للذکر (۱) ہے۔اور جو شخص مقدمات ذکر میں مشغول ہے۔ وہ گو حقیقۃً ذاکر نہ ہو مگر حکماً ضرور ذاکر ہے جیسے حدیث میں ہے کہ انتظار صلوٰۃ بحکم صلوٰۃ ہے۔ اور جو شخص سفر حج میں ہوا۔ اُس کے سب افعال بحکم حج ہیں۔ چنانچہ ارشاد ہے:﴿ وَمَنْ يَّخْرُجْ مِنْ م بَيْتِهٖ مُهَاجِرًا اِلَى اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ثُمَّ يُدْرِكْهُ الْمَوْتُ فَقَدْ وَقَعَ اَجْرُهٗ عَلَى اللّٰهِ﴾ (۲)

جس سے معلوم ہوا کہ جو شخص مقدمات ہجرت میں مشغول ہے وہ حکماً مہاجر ہی ہے۔علیٰ ہذا۔ حدیث میں ہے کہ جو شخص اللہ کے راستے میں جہاد کرنے کے لئے گھوڑا پالے تو اس کا کھانا پینا لید کرنا اور دوڑنا بھاگنا سب میزان عمل میں حسنات شمار ہوگا۔ گویا اسی وقت سے یہ شخص حکماً مجاہد ہوگا۔ پھر استعداد رسوخ ذکر کے لئے اللہ اللہ کرنا یا ذکر الٰہ کرنا بحکم ذکر کیوں نہ ہوگا، صاحب اگر آپ سے کوئی شخص یہ پوچھے کہ یہ کھانا کتنے میں تیار ہوا ہے۔تو اُس وقت آپ حساب میں سوختہ (۳) کی قیمت بھی شمار کرتے ہیں۔ حالانکہ سوختہ کھانے کی چیز نہیں۔ مگر اسی واسطے حساب میں شمار کرتے ہیں کہ وہ مقدمات میں داخل ہیں۔

اجر ذکر

پس میں نے جو اوپر کہا ہے کہ اللہ اللہ کرنا ذکر نہیں اس کا یہ مطلب نہیں کہ اس پر ثواب ذرہ بھی نہ ملے گا۔ بلکہ صرف یہ مطلب ہے کہ وہ ذکر حقیقتاً نہیں۔ ذکر حقیقۃً وہی ہے جو سنت سے ثابت ہے باقی رہا ثواب سو اس کے لئے ذکر ہونا

(۱) کیونکہ یہ ذکر کی تیاری ہے (۲)"اور جو شخص اپنے گھر سے اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف ہجرت کے ارادہ سے نکلے پھر اس پر موت واقع ہوجائے تو اس کا اجر وثواب اللہ کے ہاں ہے" سورۃ النساء:۱۰۰ (۳) کھانے کی تیاری میں جو لکڑی جلائی گئی۔

ضروری نہیں۔ بلکہ وہ تو بعض اوقات محض رحمت سے ضد پر بھی مل جاتا ہے۔ جیسے حدیث میں آتا ہے کہ قیامت میں ایک بندہ حق تعالیٰ کے سامنے پیش ہوگا۔ حق تعالیٰ اپنے انعامات جتلا کر اُس کے گناہ اُسے یاد دلائیں گے۔ کہ تو نے فلاں دن ایسا کیا اور ایسا کیا۔ اور اوّل چھوٹے چھوٹے گناہ گنائیں گے وہ بڑا گھبرائے گا کہ یہ تو چھوٹے گناہ ہیں اگر بڑے گناہوں کا تذکرہ ہوا تو پھر کیا حال ہوگا۔ تو اللہ تعالیٰ اوّل اُس کے چھوٹے گناہ جتلائیں گے پھر ارشاد ہوگا۔ اچھا جاؤ ہم نے تم کو بخشا۔ اور ہر گناہ کے عوض ایک حسنہ دیا۔ اب وہ بندہ خود اپنے گناہوں کو بیان کرے گا۔ کہ اے اللہ میں نے تو اور بھی گناہ کئے ہیں جو ان سے بڑے ہیں ان کا تو یہاں تذکرہ بھی نہیں ہوا۔ مجھے اُن کے عوض بھی نیکی دلوائے۔ غرض ثواب کا کچھ ضابطہ نہیں وہ تو اللہ تعالیٰ کے فضل پر ہے۔ وہ ذکر پر بھی ثواب دیتے ہیں اور غیر ذکر پر بھی ثواب دے سکتے ہیں۔ تو محققین صوفیہ نے اس راز کو سمجھا کہ اللہ اللہ کرنا گو ذکر نہیں۔ مگر مقصود کے لئے تیار ہونا ہے تو اس واسطے بحکم ضرور ہے (۱)۔

مشاہدہ و معائنہ

پس جس طرح ایک قسم توجہ کی یہ تھی کہ صفات کا تصور کیا جائے اور اس کو مشاہدہ کہتے ہیں۔ اسی طرح ایک قسم اُس کی یہ ہے کہ ذات بحت (۲) کا تصور کیا جائے اور اس کو معائنہ کہتے ہیں جس کے لئے ذکر اسم ذات ایک سہل طریقہ ہے۔

رؤیت باری اس دنیا میں ممکن نہیں

اور یہ مشاہدہ و معائنہ اصطلاحی الفاظ ہیں اس سے یہ مت سمجھنا کہ یہ فقیر لوگ خدا تعالیٰ کو دیکھتے ہیں۔ کیونکہ صحیح مسلم میں حدیث موجود ہے۔

(۱) ذکر کے حکم میں ضرور ہے (۲) خالص ذات حق کا۔

اِنَّکُمْ لَنْ تَرَوْا رَبَّکُمْ حَتّٰی تَمُوْتُوْا ”مرنے سے پہلے تم حق تعالیٰ کو نہیں دیکھ سکتے“۔

کہ مرنے سے پہلے حق تعالیٰ کو نہیں دیکھ سکتے اور یہ جو بعض جہلاء نے اس کے جواب میں کہا ہے۔ قَدْ مِتْنَا فَرَأَیْنَا رَبَّنَا کہ ہم تو مر چکے۔ اس لئے ہم خدا تعالیٰ کو یہیں دیکھ لیتے ہیں اور موت سے مراد وہ موت لی ہے جو مُوْتُوْا قَبْلَ اَنْ تَمُوْتُوْا میں ہے۔ تو اس کا جواب یہ ہے کہ معنوی موت صوفیوں کی خاص اصطلاح ہے اور قرآن وحدیث صوفیوں کی اصطلاح میں وارد نہیں ہوئے۔ مگر آج کل یہ الٹا دستور نکلا ہے کہ قرآن وحدیث کو اپنی اصطلاح کے تابع کرتے ہیں۔

جیسے ایک جاہل نے کہا تھا کہ یہ مولوی جو فاتحہ کا انکار کرتے ہیں بڑے جاہل ہیں۔ دیکھو خود قرآن میں ایک خاص غرض کے واسطے اتری ہے اور اسی واسطے اس کا نام سورۃ فاتحہ ہے۔ واہ رے جاہل ! ارے یہ احتمال ہی نہ ہوا۔ کہ اس اختراعی عمل کا نام فاتحہ اس صورت کے نام پر رکھ لیا ہو۔

اسی طرح ایک جاہل نے قرآن میں جو سُلْطَانًا نَّصِیْرًا وَ مَقَامًا مَّحْمُوْدًا آیا ہے۔ اُس کو صوفیہ کے بعض اشغال کا نام سمجھا ہے۔ اب کوئی اس سے پوچھے کہ جس جگہ قرآن میں یہ الفاظ آئے ہیں وہاں ان کے مراد ہونے کے بعد مطلب بھی کچھ بن سکتا ہے۔ اسی طرح حدیث اِنَّکُمْ لَنْ تَرَوْا رَبَّکُمْ حَتّٰی تَمُوْتُوْا میں لغوی موت مراد ہے۔ اصلاحی موت مراد نہیں۔ پس مشاہدہ ومعائنہ (۱) سے رویت کے قبل الموت کا دھوکہ نہ کھایا جاوے۔ اُس میں اصطلاحی معنی مراد ہیں یعنی توجہ الی الصفات وتوجہ الی الذات (۲) اور رویت مراد نہیں۔

(۱) مشاہدہ ومعائنہ سے یہ شبہ نہ ہونا چاہیے کہ مرنے سے پہلے رویت باری ہوسکتی ہے (۲) اس سے اللہ ذات وصفات کی طرف متوجہ ہونا مراد ہے۔

اور مسئلہ کی موٹی دلیل یہ ہے کہ اگر یہ ممکن ہوتا تو ان صوفیوں سے زیادہ موسیٰ علیہ السلام اس کے مستحق تھے۔ اور نص میں تصریح ہے کہ اُن کو رؤیت نہیں ہوئی۔ قَالَ لَنْ تَرَانِیْ اوراس کے بعد جوارشاد ہے۔وَلٰکِنِ انْظُرْ اِلَی الْجَبَلِ فَاِنِ اسْتَقَرَّ مَکَانَهٗ فَسَوْفَ تَرَانِی ’’لیکن پہاڑ کی طرف نظر کر اگر پہاڑ اپنی جگہ پر قائم رہا تو تم عنقریب مجھے دیکھ لوگے‘‘۔

اس میں رویت کو ایک شرط سے مشروط کیا ہے۔یعنی استقرار جبل (۱) سے اور آگے تصریح ہے کہ جبل مستقر نہیں رہا۔اس سے بھی مشروط کی نفی ہوگئی۔

ہاں حضور ﷺ کو معراج میں رویت ہوئی ہے اور وہ حدیث مذکور کے خلاف نہیں کیونکہ حدیث میں اس عالم کا حکم مذکور ہے اور حضور ﷺ کو دوسرے عالم میں رؤیت ہوئی ہے۔ کیونکہ فوق السموات عالم آخرت ہے یہ شیخ ابن عربی کی تحقیق ہے اور عجیب تحقیق ہے۔ (للہ درہ ۱۲) وہ فرماتے ہیں کہ زمان آخرت تو مستقبل ہے لیکن مکان آخرت فی الحال حاضر ہے۔

شعراء کی بیباکی

آگے شعراء کی یہ زیادتی ہے کہ حضور ﷺ کی رؤیت اور موسٰی علیہ السلام کی عدمِ رؤیت میں موازنہ کرتے ہیں اور بُری طرح موازنہ کرتے ہیں۔ یہ ضرور ہے کہ حضور ﷺ کو جملہ انبیاء پر فضیلت ہے۔مگر اس طرح موازنہ کرنا منہی عنہ ہے (۲) جس سے دوسرے حضرات کی تنقیص کا ایہام (۳) ہو جیسے ایک شاعر نے کہا ہے۔

موسیٰ زہوش رفتہ بیک جلوۂ صفات　　تو عین ذات می نگری در تبسمی (۴)

(۱) پہاڑ کے اپنی جگہ قائم رہنے کے ساتھ (۲) اس طرح تقابل ممنوع ہے (۳) دوسرے میں نقص ہونے کا وہم ہو (۴) ’’حضرت موسیٰ علیہ السلام صفات کی ایک ہی تجلی میں ہوش کھو بیٹھے اور تو عین ذات کو دیکھ کر بھی مسکراتا رہا‘‘۔

اول تو اس شاعر کو جلوۂ صفات و جلوۂ عین ذات کی تقسیم کا کیا حق تھا۔ کیا وہ دونوں جلوؤں کو دیکھ رہا تھا۔ پھر اُس نے حضور ﷺ کی جو وجہ فضیلت ظاہر کی ہے کہ حضور ﷺ موسیٰ علیہ السلام کی طرح تجلی کے وقت بے ہوش نہیں ہوئے۔ حالانکہ جس عالم میں موسیٰ علیہ السلام پر تجلی ہوئی تھی دنیا میں ممکن ہے وہاں حضور ﷺ بھی بے ہوش ہو جاتے۔ جیسے دنیا میں آپ جبرئیل علیہ السلام کو بھی دیکھ کر بے ہوش ہو گئے تھے۔ اور جہاں حضور ﷺ بے ہوش نہیں ہوئے یعنی عالم آخرت وہاں ممکن ہے موسی علیہ السلام بھی بے ہوش نہ ہوتے تو یہ ہر عالم کا الگ الگ اثر ہے یہ شعراء بڑے بیباک ہوتے ہیں۔ بعض شعراء تو اپنے محبوب کی مدح میں انبیاء علیہم السلام سے بڑھا دیتے ہیں۔ جیسے ایک شاعر کہتا ہے۔

بر آسماں چہارم مسیح بیمار است تبسم تو برائے علاج درکار است (۱)

عیسیٰ علیہ السلام اور حضرت یوسف علیہ السلام پر شعراء کی سب سے زیادہ مشق ہے اور یہ محبوبوں کی مشق میں اتنا مبالغہ کرتے ہیں جو حد سے نکل جاتا ہے۔

کرانہ میں ایک حکیم علی اکبر صاحب تھے۔ انہوں نے بعض اشعار سن کر خوب جواب دیا۔ ایک دفعہ اُن کے سامنے کسی نے نعتیہ غزل پڑھی۔ جس کے اخیر میں تھا۔ بلالو یا رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) تو حکیم صاحب کہتے ہیں کہ بے تمیز کہتا ہے بلالو یا رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) ہے نا بڑا لاڈلا بھیجیں گے تیرے واسطے پالکی تو کیوں نہیں چلا جاتا۔ ایک دفعہ کسی نے کہا۔

فلک پر دھوم (۲) تھی احمد رسول اللہ آتے ہیں۔

فرمایا بالکل جھوٹ وہاں تو کسی کو بھی خبر نہ تھی۔ حدیث صحیح میں وارد ہے کہ جب حضرت جبرائیل علیہ السلام حضور ﷺ کو لے کر آسمانوں پر پہنچے تو ہر آسمان

(۱) ”چوتھے آسمان پر عیسی علیہ السلام بیمار ہیں اُن کے علاج کے لئے تیرا تبسم درکار ہے“ (۲) آسمانوں پر شور مچا ہوا تھا۔

کے دربانوں نے دروازے کھولنے سے پہلے سوال کیا۔ مَنْ قَالَ جِبْرِيلُ ۔وَمَنْ مَّعَكَ؟ قَالَ مُحَمَّدٌ۔ قَالَ أُرْسِلَ اِلَيْهِ؟ قَالَ نعم ۔یعنی تم کون، کہا جبرئیل ہوں۔ پوچھا تمہارے ساتھ کون ہیں۔ کہا محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ پوچھا کیا آپ کے پاس معراج میں بلانے کو پیغام بھیجا گیا ہے۔ کہا ہاں اتنے سوالوں کے بعد تو کوار کھلے تھے اور تو کہتا ہے کہ فلک پر دھوم تھی رسول اللہ آتے ہیں۔ جھوٹا ہے وہاں تو کسی کو کچھ بھی خبر نہ تھی۔ واقعی یہ شاعر تو محض تک بندی کا اتباع کرتے ہیں۔ جائز ناجائز سے کچھ بحث نہیں۔

گنگوہ میں ایک شاعر تھے ان کی یہ حالت تھی کہ نماز میں اگر کوئی مصرع موزوں ہوجاتا تو فوراً نماز توڑ کر اُسے لکھ لیتے اور یوں کہتے کہ نماز کی تو قضا ہے لیکن مصرع ذہن سے نکل جاتا تو اس کی قضا کیوں کر ہوتی۔

عطاء کی ناقدری

یہ مضمون شعراء کے متعلق تبعاً ذکر ہوگیا ہے۔ میرا مقصود یہ ہے کہ دنیا میں رؤیت حق (۱) شرعاً محال ہے۔ اور مشاہدہ ومعائنہ (۲) یہ اصطلاحی الفاظ ہیں۔ معائنہ توجہ الی الذات کو کہتے ہیں اور توجہ الی الذات کے معنیٰ یہ ہیں کہ التفات بالقصد (۳) صفات وغیرہ کی طرف نہ ہو گو بلا قصد کے سامنے آجائیں۔ جیسے لکھتے ہوئے زَيْدٌ قَائِمٌ میں سے صرف زید کو دیکھنا چاہیں تو قصداً الفاظ زید کو دیکھیں گے تو تبعاً قائم بھی بلا قصد نظر آئے گا۔ کیونکہ اس کے پاس ہی ہے تو جب عشاق کی یہ حالت ہے کہ وہ خود ذات کا تصور اس طرح کرنا چاہتے ہیں کہ صفات کی طرف بھی نظر نہ ہو جو کہ ذات کے ساتھ لاعین لاغیر (۴) کا تعلق رکھتے ہیں اور مثل ذات

(۱) دیدار الٰہی شرعاً نہیں ہوسکتا (۲) یہ صوفیاء کی اصطلاحات ہیں جن کا مطلب دیدار نہیں بلکہ توجہ الی اللہ کے ہیں (۳) ارادۃً اللہ کی صفات کی طرف توجہ نہ کرے اگرچہ بلا قصد وہ سامنے آئیں (۴) نہ عین ذات ہیں نہ غیر ذات۔

کے قدیم ہیں تو وہ حق تعالیٰ کی طرف عطا واجر کی وجہ سے توجہ کریں گے اور اُن کی طرف اُن کو التفات کیونکر ہوگا۔ اس لئے کہ عطاء واجر تو افعال ہیں اور افعال حادث ہیں۔

غرض حق تعالیٰ کی طرف توجہ کرنا خود اُن کی عظمت کا حق ہے اگرچہ وہ ہماری طرف بھی توجہ نہ فرماویں چہ جائیکہ ایک دوسرا مقتضی بھی موجود ہے۔ یعنی ان کا بندہ کی طرف توجہ فرمانا۔ اس لئے حضور ﷺ نے اس حدیث میں بتلا دیا کہ اگر تم حق عظمت کی وجہ سے متوجہ نہیں ہوتے دوسرے ہی مقتضی کی وجہ سے اُدھر متوجہ ہو جاؤ کیونکہ وہ خود تمہاری طرف متوجہ ہوتے ہیں۔ اس وقت تم بھی اُدھر نگاہ رکھو گے تو کچھ نہ کچھ مل ہی جائے گا۔ مگر افسوس ہم کو عطائے حق کی اتنی بھی قدر نہیں جتنی ایک لیڈر کو چار پیسوں کی قدر تھی۔

لیڈروں کا حال

قصہ یہ ہے کہ پہلے یہ رسم تھی کہ دُلہن کے ڈولے پر منصوری پیسے بکھیرے جاتے تھے اور اس کے لوٹنے والے بھنگی ہوتے تھے اور بھنگی اس کام کے لئے دو لاٹھیوں کے بیچ میں کپڑا لے کر اس طرح بناتے تھے جیسے کشتی کا پردا ہوتا ہے۔ اور اس میں پیسوں کو روکتے تھے۔ تو جس زمانہ میں علی گڑھ یونیورسٹی کا چندہ ہو رہا تھا اُس وقت جھنجانہ میں ایک لیڈر آئے اور یہاں انہوں نے یونیورسٹی کے لئے چندہ کی تحریک کی پھر اُسی زمانہ میں ایک شادی ہوئی اور دُلہن کے ڈولے پر پیسے بکھیرے گئے تو بھنگیوں کے ساتھ یہ لیڈر بھی ان پیسوں کے لوٹنے میں شریک تھے۔ حالانکہ دُلہن والوں کو اُن کو پیسے دینا مقصود بھی نہ تھا۔ بلکہ بہت سوں کو اُن کی یہ حالت پسند بھی نہ تھی۔ مگر اُس نے پرواہ نہ کی اور یہ سمجھا کہ جب بکھیر ہوگی تو کوئی

پیسہ تو میرے کپڑے میں بھی آ ہی گرے گا۔ غرض بھنگیوں کی طرح آپ بھی پیسے لوٹنے میں شریک ہوئے اور جو پیسے آئے ہیں وہ کالج کے چندہ میں داخل کیے۔ اس پر قوم نے بڑی مدح کی یہ ایسے فدائے قوم ہیں کہ خدمت کالج کے لئے ذلت کی بھی پرواہ نہیں کرتے۔

واقعی مولوی اگر ایسی حرکت کریں تو ذلت ہے اور لیڈر کریں تو عزت ہے کیونکہ یہ جو کچھ کرتے ہیں شاندار لباس پہن کر کرتے ہیں اور مولوی جو کچھ کرتے ہیں معمولی لباس پہن کر کرتے ہیں۔ پھر اس میں ایک اور لطیفہ ہوا۔ یہ لیڈر صاحب پیسے لوٹ کر جب نماز کے لئے مسجد میں آئے اور ایک شخص سے مل کر صف میں کھڑے ہونے لگے تو اُس نے کہا اُدھر ہٹو میرے کپڑوں سے کپڑے نہ ملانا۔ میں دیکھ رہا تھا کہ اُس وقت بھنگیوں کو پسینہ آ رہا تھا۔ اُن کے کپڑے سب تر تھے اور تم اُن کے کندھے سے کندھا ملائے ہوئے چل رہے تھے۔ خیر حکایت تو ہنسی کی ہے مگر مجھے یہ بتلانا ہے کہ ہم لوگوں کو عطائے حق کی اتنی بھی قدر نہیں جتنی اس لیڈر کو چار پیسوں کی قدر تھی کہ وہ اُن کے لوٹنے کو بھنگیوں کی طرح دامن پھیلائے ہوئے تھا۔ اور بھنگیوں کے ساتھ چلنے میں بھی عار نہ کرتا تھا۔

صاحبو! اسی طرح ہم کو چاہئے کہ ہر وقت حق تعالیٰ کے سامنے دامن پھیلائے رہیں۔ کیونکہ نہ معلوم کس وقت بکھیر ہونے لگے۔ اگر ہر وقت دامن پھیلائے رہوگے۔ تو ان شاء اللہ کچھ نہ کچھ تمہارے دامن میں بھی ضرور ہی آ جائے گا۔ اسی کو کہتے ہیں ؎

یک چشم زدن غافل ازاں شاہ نباشی شاید کہ نگاہے کند آگاہ نباشی(۱)

پھر اس لیڈر کو تو بھنگیوں کی رفاقت حاصل تھی اور تم کو رفاقت حاصل ہوگی انبیاء

(۱) ایک آن کے لئے بھی اس بادشاہ سے غافل نہ ہو بہت ممکن ہے کہ وہ نگاہِ کرم فرمائیں اور تو بے خبر رہے"۔

وشہداء کی۔﴿ فَاُولٰٓئِكَ مَعَ الَّذِيْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِّنَ النَّبِيّٖنَ وَالصِّدِّيْقِيْنَ وَالشُّهَدَآءِ وَالصّٰلِحِيْنَ ﴾(۱)

سبقت توجہات

اب میں مثنوی کے چند اشعار پڑھتا ہوں۔ مولانا نے اُن میں اسی حدیث کا ترجمہ کیا ہے۔ دفتر اوّل داستان پیر چنگی کے قصہ میں فرماتے ہیں ؎

گفت پیغمبر کہ نفحتہائے حق　　اندریں ایام می آرد سبق (۲)

یعنی حق تعالیٰ کی توجہات ہماری طرف سبقت کرتی ہیں ؎

گوش ہشد ارید ایں اوقات را　　در ربائیدایں چنیں نفحات را(۳)

یعنی اُن نفحات کو حاصل کرو ؎

نفحۂ آمد شمارا وید ورفت　　ہر کرامی خواست جاں بخشید ورفت (۴)

یعنی ایک نفحہ اور ایک توجہ ہوئی اور جس میں اُس نے طلب دیکھی اس کو جان بخش دی۔ یعنی اُس کی روح کو تازگی دیدی یا اُس میں جان ڈال دی اور چل دیا۔ ایک تم غافل تھے تم محروم رہ گئے۔ آگے غافلوں کو متنبہ کرتے ہیں کہ ایک نفحہ سے محروم رہ گئے تو نفحہ ثانیہ کی طرف توجہ کرو اور اس کو ہاتھ سے نہ جانے دو ؎

نفحۂ دیگر رسید آگاہ باش　　تا ازیں ہم وانہ مانی خواجہ باش(۵)

یہ حضرات زبان فہم ہیں چونکہ حدیث میں نفحات اور ساعات بصیغہ جمع وارد

(۱)''وہ ان لوگوں کے ساتھ ہوں گے جن پر اللہ تعالیٰ نے انعامات فرمائے حضرات انبیاء علیہم السلام، صدیقین اور شہداء اور نیک لوگوں کے ساتھ'' (سورۃ النسا:۶۹) (۲)''نبی نے فرمایا کہ عنایاتِ حق تعالیٰ ان دنوں میں تمہاری طرف سبقت کرتی ہیں'' (۳)''ان اوقات کا خاص خیال رکھو اور سبقت کرو اس قسم کی خوشبوؤں کے حاصل کرنے کی'' (۴)''تم پر عنایت کی گھڑی آئی اور گزر گئی جو شخص اس کا جویاں تھا اس کو جاوید زندگی بخش گئی'' (۵)''ایک جھونکا توجہ الٰہی کا پھر آیا خبردار رہ تا کہ اس مرتبہ بھی عاجز نہ رہ جائے اپنے ہم مشربوں سے''۔

ہے جس سے تکرار مفہوم ہوتا ہے کہ مختلف اوقات میں مختلف توجہات ہوتی ہیں۔ اس لئے مولانا نے نفحۂ دیگر رسید فرمایا۔

تاثیر توجہ

آگے اس نفحۂ کی تاثیر وفیض کو بیان کرتے ہیں اور اس کی کیفیت کو ؎

جان مُردہ یافت از وے جنبشے — جان آتش یافت زاں آتش کشے (۱)

مردہ پوشید از بقائے او بقاء — جان ناری یافت از وے انطفا (۲)

ہمچو جنبشہائے خلقاں نیست ایں — تازگی وجنبش طوبیٰ ست ایں (۳)

یعنی حق تعالیٰ کی نفحات میں حادث ومخلوق کی طرح جنبش وحرکت نہیں وہ ان آثار سے پاک ہیں۔آگے اثر کا بیان ہے ؎

زہرۂ شاں آب گردد در زماں — گر در افتد در زمین وآسماں (۴)

یعنی اگر یہ توجہ پہاڑ وغیرہ پر ہوجاتی تو اُن کا پتہ پانی ہوجاتا یہ اشارہ ہے آیت: ﴿لَوْ اَنْزَلْنَا هٰذَا الْقُرْاٰنَ عَلٰی جَبَلٍ لَّرَاَیْتَهٗ خَاشِعًا مُّتَصَدِّعًا مِّنْ خَشْیَةِ اللّٰهِ﴾ (۵) کی طرف۔کہ اگر یہ قرآن پہاڑ پر نازل ہوتا کہ وہ بھی حق تعالیٰ کی ایک توجہ ہے تو وہ خوف الٰہی سے پست ہوجاتا۔اور پھٹ جاتا۔

اشکال کا جواب

یہاں ایک اشکال ہے وہ یہ کہ جب قرآن میں یہ اثر ہے تو انسان پر یہ اثر

(۱)''جاں نے گرمی پائی اس آگ بجھانے والے سے جاں مردہ نے بھی اس سے حرکت حاصل کی''
(۲)''سوختہ جاں نے اس سے ٹھنڈک پائی اس سراپا زندگی سے مردہ نے بھی لباس زندگی حاصل کرلیا'' (۳)''یہ تازگی اور زندگی کیفیت سے مسرت ہیں اور یہ (حرکت دنیا) مخلوق کے افعال کی طرح نہیں ہیں'' (۴)''اگر توجہات الٰہیہ زمین وآسمان پر نزول فرماویں تو اس وقت ان کا پتہ پانی ہوجاوے'' (۵)''اگر ہم اس قرآن کو کسی پہاڑ پر نازل کرتے تو تُو اُس کو دیکھتا کہ خدا کے خوف سے دب جاتا اور پھٹ جاتا'' سورۃ الحشر:۲۱۔

کیوں ظاہر نہیں ہوتا۔ اگر یہ کہا جائے کہ انسان میں تاثر کی استعداد نہیں (۱) تو اس صورت میں اس کا عذر تو ظاہر ہے۔ مگر سیاق آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ مضمون انسان کو غیرت دلانے کے لئے سنایا گیا ہے۔ کہ تم ایسے سنگدل ہو کہ قرآن سن کر بھی ٹس سے مس نہیں ہوتے۔ حالانکہ وہ اگر پہاڑ پر نازل ہوتا تو اُس کی یہ حالت ہو جاتی ۔ تو اگر انسان میں تاثر کی استعداد نہیں تو اس حالت میں غیرت دلانا بیکار ہوگا۔ وہ یہ کہہ سکتا ہے کہ مجھ میں یہ استعداد ہوتی تو میری بھی وہی حالت ہوتی۔ اور اگر انسان میں استعداد تاثر ہے تو پھر سوال یہ ہے کہ اُس پر یہ اثر کیوں ظاہر نہیں ہوتا۔

جواب یہ ہے کہ انسان میں تاثر کی استعداد تو موجود ہے۔ مگر اس کے ساتھ ہی اس میں تحمل کی قوت بھی پہاڑ سے زیادہ ہے۔ اگر پہاڑ پر حق تعالیٰ کا کلام نازل ہوتا تو اُس میں خشوع تاثر کے ساتھ انشقاق وتصدع (۲) بھی ہوتا۔ کیونکہ اُس میں قوت تحمل نہیں ہے۔ تم میں اگر بوجہ تحمل وانشقاق وتصدّع (۳) نہیں ہے۔ تو کم از کم تاثر وخشوع (۴) تو ہونا چاہئے۔ تو شکایت اس کی نہیں کہ قرآن سن کر تمہارے دل پھٹ کیوں نہیں گئے۔ بلکہ شکایت اس کی ہے کہ خشوع کیوں نہیں پیدا ہوا۔ اور انسان میں قوت تحمل کا جبال (۵) سے زائد ہونا دوسری آیت سے معلوم ہوتا ہے۔ ﴿اِنَّا عَرَضْنَا الْاَمَانَةَ عَلَى السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَالْجِبَالِ فَاَبَيْنَ اَنْ يَّحْمِلْنَهَا وَاَشْفَقْنَ مِنْهَا وَحَمَلَهَا الْاِنْسَانُ ط اِنَّهٗ كَانَ ظَلُوْمًا جَهُوْلًا﴾۔ (۶)

اسی کو عارف اسی طرح فرماتے ہیں ؎

---

(۱) انسان میں متأثر ہونے کی استعداد نہیں (۲) پست ہو جاتا اور پھٹ جاتا (۳) پھٹنا اور ٹکڑے ہونا نہیں ہے (۴) کم از کم اس سے متأثر تو ہو اور خشیت تو ہو (۵) پہاڑوں سے زائد ہونا (۶) ''بلاشبہ ہم نے یہ امانت (احکام) آسمانوں اور زمین اور پہاڑوں کے سامنے پیش کی تھی بس انہوں نے اس کی ذمہ داری سے انکار کر دیا تھا اور اس سے ڈر گئے اور انسان نے اسے اپنے ذمہ لے لیا بیشک وہ جاہل ہے'' (سورۃ الاحزاب: ۷۲)۔

آسماں بار امانت نتوانست کشید　　قرعہ فال بنام من دیوانہ زدند(۱)

دوام توجہ

بہرحال مولانا نے اس جگہ ان نفحات کی تاثیر بیان کرکے یہ فرمایا ہے کہ ہم کو ان توجہات کے لئے تیار رہنا چاہئے۔ شکایت اس کی ہے کہ ہم حق تعالیٰ سے غافل ہیں۔ حالانکہ ہم کو ہر وقت ان کی طرف دائمی توجہ رکھنا چاہئے تھی۔ کیونکہ ان نفحات سے متمتع وہی ہوسکتا ہے جو ہر وقت ادھر متوجہ رہے اس لئے کہ ان کا کوئی خاص وقت معین نہیں۔

اس پر اگر کوئی یہ کہے کہ حق تعالیٰ کی طرف دائمی توجہ کیونکر رہے کیا کھائیں پئیں نہیں اور بیوی بچوں کو چھوڑ دیں کیونکہ دائمی توجہ تو اس طرح ہوسکتی ہے کھانے پینے اور بیوی بچوں میں لگنے کے ساتھ توجہ دائمی حق تعالیٰ کی طرف سے کیونکر ہو تو میں کہتا ہوں کہ ابھی طاعون کا زمانہ گزرا ہے۔ انصاف سے بتلاؤ اس زمانہ میں اگر اپنے کسی عزیز کی بیماری کی اطلاع آئی تھی اور جانے میں دو چار دن کی دیر ہوگئی تو یہ دن کیسے گزرے تھے۔ یقیناً دل ہر وقت اس عزیز کی طرف رہا تھا۔ گو ظاہر میں کھانا پینا بھی ہوتا تھا۔ یہاں آپ کو کبھی اشکال نہ ہوا کہ کھانے پینے کے ساتھ عزیز کی طرف دل کیونکر لگا رہا۔ بس بات یہ ہے کہ اس کی محبت دل میں رچی ہوئی تھی۔ اس لئے کوئی کام بھی اس کی طرف توجہ قلب سے مانع نہ ہوا(۲)۔ خدا کی قسم پھر خدا کی قسم تم کو خدا تعالیٰ کی طرف دائمی توجہ رکھنے پر اشکال صرف اسی واسطے ہے کہ تم نے خدا تعالیٰ کو اپنے دل میں رچایا نہیں اگر وہ دل میں رچ جاتے تو پھر تمہارے نکالنے سے بھی نہ نکلتے۔ دیکھو آمدن کے معنی تمہارے دل میں جمے ہوئے ہیں۔ بھلا اس کو

(۱) ''جس بار امانت کو زمین و آسمان نہ اٹھا سکا اُس کا قرعہ میرے جیسے دیوانہ کے نام نکل آیا'' (۲) کوئی کام بھی دل کے اس کی طرف متوجہ ہونے سے رکاوٹ کا باعث نہ ہوا۔

کوئی بھلا تو دے۔ ہرگز نہیں بھلا سکتا۔ تو صاحب جو چیز دل میں جم جاتی ہے وہ نکالنے سے بھی نہیں نکل سکتی۔ بس شکایت اسی کی ہے کہ تم نے خدا تعالیٰ کو اپنے دل میں اتنا بھی نہیں رچایا۔ جتنا آمدن کے معنی کو رچا رکھا ہے۔

مرغوب و مرہوب

یاد رکھو دو چیزیں دل سے نہیں نکل سکتیں ایک مرغوب، ایک مرہوب۔ ہمارے استاد فرماتے تھے کہ شوق علم تپ دق ہے(۱) یا تو ہوتا نہیں اور جو ہوتا ہے تو پھر دل سے نکلتا نہیں تو یہ شوق علم جنم روگ ہے۔ بلکہ محبت و رغبت کسی شئے کی ہو جنم روگ ہی ہے۔ جب کسی سے ایک بار محبت ہو جاتی ہے پھر وہ مرتے دم تک نہیں نکلتی۔ مگر محبت ہونا چاہئے۔

محبت کا اثر

پھر اگر محبوب سے وصال بھی نہ ہو تو اس کے ذکر میں وہ لذت آتی ہے کہ یاد ہی کافی ہو جاتی ہے۔ لیلیٰ کا قصہ ہے کہ وہ کسی وقت میں مجنوں کے سامنے آئی تو مجنوں نے اُس کو پہچانا نہیں۔ پوچھا کون ہے کہا میں لیلیٰ ہوں مجنوں نے کہا: (اِلَیْکَ عَنِّیْ فَاِنَّ حُبَّکَ شَغَلَنِیْ عَنْکَ) جاؤ اب مجھے تمہاری ضرورت نہیں تیری محبت نے مجھے تیرے وصال سے مستغنی کر دیا(۲)۔ پھر یہ یاد دل میں ایسی پیوستہ ہوتی ہے کہ اگر اس سے روکا جائے تو وہ باز نہیں آتا۔ مجنوں ہی کا قصہ ہے کہ اُس کا باپ اُس کو مکہ معظّمہ لے گیا۔ اور کہا کہ بیت اللہ کا پردہ پکڑ کر دُعا کرو کہ خدا تیرے دل سے لیلیٰ کا خیال نکال دے تو وہ کہتا ہے ؎

(۱) علم کا شوق تپ دق کے بخار کی طرح ہے یا تو ہوتا نہیں ہو جائے تو دل سے نکلتا نہیں (۱) تیری ملاقات سے بے نیاز کر دیا۔

یَـارَبِّـیْ لَا تَسْـلُبْـنِـیْ حُبَّهَـا اَبَدَا　　　وَیَـرْحَـمُ الـلّٰـهُ عَبْـداً قَالَ آمِیْنَا(۱)

اِلٰهِـیْ تُبْـتُ مِـنْ کُـلِّ الْـمَعَاصِیْ　　　وَلٰـکِـنْ حُـبُّ لَیْـلٰی لَا اَتُوْبُ (۲)

عارفین کی محبت کا حال

جب عشق مجازی میں یہ کیفیت ہوتی ہے تو حق تعالیٰ کی محبت میں کیا حال ہونا چاہئے۔ حقیقت میں عارفین کو حق تعالیٰ سے محض اُن کے کمالات کی وجہ سے محبت ہوتی ہے۔ اگر اُن کو یہ بھی معلوم ہو جائے کہ ہماری توجہ وطلب کے بعد بھی حق تعالیٰ توجہ نہ کریں گے یا وصال سے مشرف نہ فرمائیں گے۔ تب بھی وہ محبت وطلب سے نہیں رُکتے کیونکہ حق تعالیٰ کے کمال کا مقتضیٰ ہی یہ ہے کہ اُن کو ہر حال میں چاہا جاوے اور یاد کیا جائے۔ بس عارفین تو ہر وقت زبان حال سے یوں کہتے ہیں ؎

ملنے نہ ملنے کا تو وہ مختار ہے آپ　　　پر تجھ کو چاہئے کہ تگ و دو لگی رہے

چہ جائیکہ وہ خود سبقت فرماتے ہیں (۳)

مراقبۂ محبتِ حق

چنانچہ اس حدیث سے یہی معلوم ہوتا ہے انّ لـربّکـم فـی دهـر کـم نفحات الا فتعرضوا لها ۔اس میں حضور ﷺ نے ہم کو متوجہ ہونے کا امر اس بناء پر فرمایا ہے کہ حق تعالیٰ ساعاتِ دہر میں ہمارے اوپر خود توجہ فرماتے رہتے ہیں۔

اور آیت ﴿اَنُلْزِمُکُمُوْهَا وَاَنْتُمْ لَهَا کٰرِهُوْنَ﴾ سے اس کے تعارض کا

(۱)''اے اللہ اُس کی محبت کبھی میرے دل سے مت نکالئے اللہ تعالیٰ اُس شخص پر رحم فرماوے جو اس پر آمین کہے'' (۲)''اے اللہ میں تمام گناہوں سے معافی مانگتا ہوں لیکن لیلیٰ کی محبت سے توبہ نہیں کرتا'' (۳) چہ جائے کہ اللہ تعالیٰ خود تمہاری طرف متوجہ ہوتے ہیں۔

شبہ نہ کیا جائے کیونکہ یہ تو اُن کی توجہ اوّل کے بعد تمہاری کراہت کے متعلق ہے کہ جب وہ توجہ فرمائیں اگر تم اُس وقت بھی اُدھر رُخ نہ کرو۔ بلکہ اعراض ہی کئے جاؤ تو اُس کے بارے میں فرماتے ہیں کہ کیا ہم اپنی رحمت تمہارے سر چپکا دیں۔ حالانکہ تم اُس سے کراہت ہی کئے جاتے ہو۔ پھر اُن کی اس سبقت اور توجہ اوّل کے بعد جب تم اُدھر متوجہ ہوتے ہو تو وہ اس معاوضہ پر قصہ ختم نہیں کردیتے۔ کہ ہم نے اُس کو دیکھا تھا اُس نے ہم کو دیکھ لیا۔ جاؤ بدلہ ہوگیا۔ بلکہ اس کے بعد مکرر پھر توجہ فرماتے ہیں۔ چنانچہ ارشاد ہے:(مَنْ تَقَرَّبَ اِلٰی شِبْرًا تَقَرَّبْتُ اِلَیْهِ ذِرَعًا وَمَنْ تَقَرَّبَ اِلَیَّ ذِرَاعًا تَقَرَّبْتُ اِلَیْهِ بَاعًا وَّ وَمَنْ اَتَانِیْ یَمْشِیْ اَتَیْتُ اِلَیْهِ هُرْوَلَةً)(الحدیث)''جو مجھ سے ایک بالشت قریب ہوتا ہے۔ میں اُس سے ایک ہاتھ قریب ہوجاتا ہوں اور جو ایک ہاتھ قریب ہوتا ہے اُسے ایک گز قریب ہوجاتا ہوں اور جو میری طرف چل کر آتا ہے۔ میں اُس کی طرف دوڑ کر جاتا ہوں''

پھر اس دوسری توجہ کو وہ خالی نہیں چھوڑتے۔ بلکہ اس سے بندہ کو اپنا مقرب بنالیتے ہیں۔ افسوس ہے کہ ایسے محبوب کو بھی تم یاد نہیں کرتے۔ کیا خدا تعالیٰ سے زیادہ یا برابر کسی کو صاحب کمال صاحب جمال صاحب نوال تم نے دیکھ لیا ہے[1] جو اُسے چھوڑ کر اغیار میں مشغول ہو۔ بخدا ہرگز نہیں خدا تعالیٰ سے بڑھ کر یا برابر حسن و جمال عطاء و نوال رحم و کرم کسی میں یہ ہے، نہ ہوسکتا ہے۔ پھر حیرت ہے کہ ہم اُدھر متوجہ نہیں ہوتے۔ حالانکہ وہ بار بار ہماری طرف متوجہ ہوتے ہیں۔

شاید تم کہو کہ صاحب توجہ و ذکر فرع ہے محبت کی اور افسوس ہم کو محبت ہی حاصل نہیں تو میں کہتا ہوں کہ اوّل تو آپ کو اس حالت پر رونا چاہئے کہ آپ کو حق تعالیٰ سے محبت نہیں اور دنیا مُردار سے محبت ہے دوسرے میں آپ کو اطلاع کرتا ہوں کہ

(۱) کیا اللہ سے زیادہ بھی کسی میں کمال وخوبصورتی اور داد و دہش ہے۔

حق تعالیٰ سے محبت تو آپ کو ہے مگر آپ کو خبر نہیں۔ میں پوچھتا ہوں کہ کسی چیز سے بھی آپ کو محبت ہے یا نہیں۔ یقیناً ہر شخص کو کسی نہ کسی چیز سے ضرور محبت ہے۔ پھر میں پوچھتا ہوں کہ اس چیز سے محبت کیوں اور کس وجہ سے ہے یقیناً کسی کمال کی وجہ سے ہوگی۔ اور اگر کسی کو کسی سے بالذات محبت ہے جس کا مقتضاء یہ ہوگا کہ خواہ اُس میں اسباب مبغوضیت(۱) کے بھی پیدا ہوجائیں تب بھی محبت باقی رہے تو وہ محبت خود بدذات ہے۔ دوسرے ایسے بہت کم ہیں۔ عموماً ہر محبوب کے ساتھ کسی کمال کی وجہ سے محبت ہوا کرتی ہے۔ خواہ حسن ہو یا جمال یا اور کوئی وصف ہو اور ظاہر ہے کہ تمام کمالات کی اصل حیات و وجود ہے۔

محبت الٰہی کی حقیقت

کیونکہ بدوں حیات و وجود کے کوئی کمال اور کوئی وصف ظاہر نہیں ہوسکتا بلکہ محققین کا تو قول یہ ہے کہ صفت کمال بس ایک وجود ہی ہے اور باقی تمام صفاتِ کمال اُسی کے مظاہر مختلفہ ہیں۔ اور وجود کسی مخلوق کی صفت ذاتی نہیں یعنی کسی کے گھر کا نہیں۔ بلکہ تمام مخلوقات کا وجود اُن کی صفت عرضی ہے اور درحقیقت یہ اللہ تعالیٰ کی صفت ذاتی ہے۔ تو جس چیز میں بھی آپ کسی کمال کا مشاہدہ کررہے ہیں۔ وہ حقیقت میں حق تعالیٰ کا کمال ہے پھر جب اُس سے آپ کو محبت ہے وہ حقیقت میں حق تعالیٰ ہی سے محبت ہوئی۔ مگر آپ کو خبر نہیں۔ اس کی مثال ایسی ہے جیسے زمین پر دھوپ کو دیکھ کر کوئی شخص زمین کا عاشق ہوجائے تو حقیقت میں وہ آفتاب کا عاشق ہے کیونکہ ضیاء دراصل اُسی کے ساتھ قائم ہے مگر اس شخص کو آفتاب کی خبر نہیں۔ اس لئے دھوپ کو زمین کا کمال سمجھ کر اُس کو یاد کرتا۔ اور اُسی کا نام

(۱) ناپسندیدگی کے اسباب۔

زبان سے رٹتا ہے۔ جس وقت اُس کو حقیقت کی خبر ہوگی کہ دھوپ تو آفتاب کی صفت تھی اُس وقت اپنی غلطی پر افسوس کرے گا اور جس کو اس حقیقت کا انکشاف ہوگیا ہے وہ تو ہر چیز میں کمالِ حق کا مشاہدہ کر کے یوں کہتا ہے ؎

حسن خویش از روئے خوباں آشکارا کردۂ ۔۔۔ پس بچشم عاشقاں خود را تماشا کردۂ (۱)

پرتو حسنت نگنجد در زمین و آسمان ۔۔۔ در حریم سینہ حیرانم کہ چوں جاشا کردۂ (۲)

اشکال کا جواب

شاید اس پر کوئی یہ کہے کہ پھر تو ہر حسین کو دیکھنا چاہئے خواہ امرد ہو یا نامحرم (۳)۔ کیونکہ سب مظہر حق ہیں۔ اس کا جواب یہ ہے کہ بے شک تمام مخلوق مرایائے (۴) حق ہیں۔ مگر محبوب نے ایک آئینہ میں سے نظر کرنے کو منع کر دیا ہے۔ اگر کہو کیوں تو تم کو غلام و عاشق ہو کر کیوں کا حق نہیں۔ ہمارے استاد فرماتے ہیں ہر درویشے کہ چوں و چرا کند و ہر طالب علمے کہ چوں و چرا نکند۔ ہر دو در چراگاہ باید فرستاد۔ (ہر وہ درویش جو چون و چورا کرے اور ہر وہ طالب علم جو چون و چورا کرے دونوں کو نکال دیا جائے درویش کو خانقاہ سے اور طالب علم کو مدرسہ سے) یہ نہ سمجھا کہ حاکمانہ جواب دے کر خاموش کر دیا بلکہ میرے پاس اس کا حکیمانہ جواب بھی ہے۔ مگر طالب و عاشق کو جواب وسوال کا عادی نہ ہونا چاہئے اس لئے میں نے اول وہ جواب دیا جو آپ کے مناسب حال ہے۔

وہ حکیمانہ جواب یہ ہے کہ جن مرایا (۵) میں نظر کرنے سے ممانعت کر دی گئی ہے ان مرایا میں خاصیت یہ ہے کہ یہ ناظر کی نظر کو اپنے ہی تک مقصود

(۱) ''محبوں کی شکل میں تو نے اپنے کو ظاہر کیا ہے اور چشمہ عاشقاں کو تو نے اپنے لئے تماشا بنایا ہے'' (۲) تیرا پرتوے حسن جب زمین وآسمان میں نہ سماسکا تو میں حیران ہوں کہ تو نے خانہ دل میں کس طرح جگہ کرلی (۳) خواہ کوئی غیر عورت ہو یا نابالغ بچہ (۴) آئینہ حق (۵) جن آئینوں میں دیکھنے سے منع کر دیا ہے۔

کر لیتے ہیں(۱) ان کو دیکھ کر آگے نظر بہت کم پہنچتی ہے۔ اس لئے حق تعالیٰ نے امارد وغیرہ محارم کی طرف نظر کرنے سے منع فرما دیا۔ کیونکہ واقعی ہم نے ایسا بہت کم دیکھا ہے کہ کوئی شخص امارد وغیر محارم پر نظر کر کے خدا تک پہنچا ہو اور اُن سے مرآۃ کا کام لیا ہو۔ بلکہ یہ مرایا رائی کو نظر کو اپنے ہی تک روک لیتے ہیں۔

محبت الٰہی بڑھانے کا مراقبہ

بہرحال یہ کہنا غلط ہے کہ ہم کو خدا تعالیٰ سے محبت نہیں۔ یقیناً ہر شخص کو جس چیز سے بھی محبت ہے وہ درحقیقت حق تعالیٰ ہی سے محبت ہے مگر آپ کو خبر نہیں۔ اب آپ کو یہ چاہئے کہ جس چیز سے کسی کو محبت ہو۔ اُس میں یہ غور کرے کہ یہ کمال اس کے اندر کہاں سے آیا۔ مسلمان کا دِل فوراً جواب دے گا کہ حق تعالیٰ نے پیدا کیا تو اب دل کو سمجھانا چاہئے کہ

چہ باشد آں نگار خود کہ بندد ایں نگارہا

''وہ کتنا حسین ہوگا کہ جس نے اپنی مخلوق کو ایسا حسن بخشا''

کہ جس نے ایسی ایسی چیزیں پیدا کی ہیں وہ خود کیا کچھ ہوگا۔ اور اس کے ساتھ ہی محبوب مجازی کے فناء ونیست (۲) ہونے کو بھی ذہن میں حاضر کیا جائے کہ یہ چند روز میں فناء ہو کر خاک ہو جائے گا۔ اس کا کمال وحسن عارضی ہے اور حق تعالیٰ کا کمال ذات وباقی ہے اور

عشق با مردہ نباشد پائدار عشق رابا حی و با قیوم دار(۳)

(۱) دیکھنے والے کو اپنی ذات تک ہی محدود کر دیتے ہیں (۲) نیست نابود ہونے کو سوچے (۳) ''تعلق حقیقی مرنے والے کے ساتھ ناپائیدار ہے محبت کا تعلق تو صرف حی وقیوم ہی کے لئے شایان ہے'' (۴) نیست نابود ہونے کو سوچے۔

اس مراقبہ سے حق تعالیٰ کے ساتھ محبت کے تعلق کا احساس ہوجاوے گا۔ اور سب سوالات رخصت ہوجائیں گے۔

نقصِ طاعات

اوراس کے بعد میں تنزل کر کے کہتا ہوں کہ فرضاً اگر آپ کو محبت نہیں ہے تو رہبیت ہی سے کام لو۔ محبوب کو تو کبھی بھول بھی جاتے ہیں مگر مرہوب [1] کو تو کوئی کبھی بھول ہی نہیں سکتا۔ جس کے لئے پھانسی کا حکم ہو چکا ہو گو وہ کھائے گا بھی پیئے گا بھی۔ ہنسے کا بھی۔ سوئے کا بھی۔ کیونکہ مشہور ہے کہ نیند سولی پر بھی آتی ہے۔ مگر پھانسی کا خیال کسی وقت دل سے نہ اُترے گا۔ اس کا خیال آرہ کی طرح ہر وقت دل کو چیرتا رہے گا۔ چنانچہ آج کل گو طاعون سے کچھ بے فکری سے ہوگئی ہے۔ کیونکہ بہت دن کا قصہ ہوگیا ہے۔ اس لئے اب لوگ کاروبار بھی کرتے ہیں۔ ہنستے بولتے بھی ہیں۔ مگر اس کا خیال دل سے نہیں اُترتا۔ ہر وقت موت ہی پیش نظر ہے۔ اسی طرح اگر تم حق تعالیٰ سے خوف اپنے دل میں پیدا کرلو تو اس سے بھی اُن کی یاد دل میں جم جائے گی۔ اور خوف پیدا کرنا اس کے لئے بھی ضروری ہے کہ اس کے اسباب ہر وقت ہمارے سامنے ہیں۔

چنانچہ گناہ تو ہیں ہی ڈر کی چیز۔ ہماری تو طاعت بھی ڈرنے کی چیزیں ہیں۔ چنانچہ جب آیت ﴿وَالَّذِيْنَ يُؤْتُوْنَ مَآ اٰتَوْا وَّقُلُوْبُهُمْ وَجِلَةٌ اَنَّهُمْ اِلٰى رَبِّهِمْ رٰجِعُوْنَ﴾ نازل ہوئی تو حضرت عائشہ صدیقہؓ نے خدا تعالیٰ اُن کے درجات بلند فرمائیں حضور ﷺ سے سوال کیا اور واقعی عجیب سوال کیا۔ اور حضرت صدیقہؓ کے تمام سوالات عجیب ہی ہوتے تھے۔ جن سے اُن کی فہم وذکاوت ظاہر

(۱) حالت خوف۔

ہوتی ہے۔ آپ ﷺ سے سوال کیا، یا رسول اللہ ﷺ کیا یہ وہ لوگ ہیں جو زنا نہ وسرقہ کر کے حق تعالیٰ سے ڈرتے ہیں۔ آپ علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا لا یا موفقۃ۔

بل هم الذين يصلون ويصومون ويتصدقون وقلوبهم وجلة يخافون ربهم ان لا يقبل منهم او كما قال۔

حضور ﷺ نے فرمایا نہیں۔ بلکہ یہ وہ لوگ ہیں جو نماز روزہ صدقہ وغیرہ سب کچھ کرتے ہیں اور پھر ڈرتے رہتے ہیں کہ شاید قبول نہ ہو۔

اسی لئے اہل اللہ کہتے ہیں کہ ہماری طاعت بھی سیئات (۱) ہیں کیونکہ ناقص ہیں۔ ان کی ایسی مثال ہے جیسے باورچی نے کھانا پکایا اور نمک تیز کر دیا۔ جس سے کھانا تلخ ہوگیا۔ وہ سمجھتا ہے کہ میں نے خدمت کی مگر واقع میں آقا کی لاگت ہی ڈبودی۔ پھر تماشا یہ کہ آقا کہتا ہے کہ نمک تیز ہے اور وہ اصرار کرتا ہے کہ نہیں تیز نہیں۔ جیسے ایک بھولے بزرگ کا قصہ ہے کہ ایک دفعہ انہوں نے بیوی سے کہا کہ کھانے میں نمک تیز ہے۔ اُس نے انکار کیا۔ آپ نے دھمکایا کہ نمک بہت تیز ہے۔ اس نے اصرار کیا کہ بالکل تیز نہیں۔ تو آپ فرماتے ہیں کہ یا تو خطا کا اقرار کرو ورنہ میں تیرے مقابلہ میں فوج لاتا ہوں وہ سمجھی کہ ویسے ہی مذاق کرتے ہیں۔ ان کے پاس فوج کہاں دھری ہے۔ اور وہ اپنی بات پر جمی رہی اور کہا جس کو چاہو بلالو میں اقرار نہ کروں گی۔ تو آپ نے فوراً حاکم شہر کے نام کو جو کہ اُن کا معتقد تھا۔ خط لکھا کہ ہم کو ایک غنیم کے مقابلہ کے لئے فوج کی ضرورت ہے۔ جلدی ایک دستہ فوج کا بھیج دیا جائے۔ حاکم نے خط دیکھتے ہی فوراً فوج روانہ کردی۔ جب فوج گھر پر آگئی تو بیوی سے کہا اب بھی خطا کا اقرار کرلے ورنہ فوج کو فائر کرنے کا حکم دیتا ہوں۔ اب تو وہ ڈر گئی کہ ان حضرات سے یہ بھی کچھ بعید

(۱) نیکیاں بھی گناہ ہی ہیں۔

نہیں۔ فوراً اقرار کرلیا کہ ہاں واقعی نمک تیز ہے۔ آپ نے فوج کو واپس کر دیا۔ اور حاکم کو جواب لکھ دیا کہ میں آپ کا بہت ممنون ہوں۔ مگر غنیم نے صلح کرلی ہے۔ اس لئے فوج واپس کرتا ہوں۔ خیر یہ حکایت تو ہنسی کی ہے۔ مگر میں کہتا ہوں کہ اگر کوئی باورچی نمک تیز کر کے اصرار کرے کہ تیز نہیں تو کیا وہ خادم کہلائے گا۔ ہرگز نہیں اور نہ یہ خدمت اس قابل ہے کہ اس کو خدمت کہا جائے۔ اب تو معلوم ہوگیا کہ ہماری طاعات بھی معاصی ہیں۔ کیونکہ وہ سراپا ناقص ہیں اور ہم کو نقص کی خبر بھی نہیں بلکہ ہم اپنے دل میں خوش ہیں کہ آج اتنی رکعتیں پڑھیں۔ اتنا ذکر کیا تو ہم اُسی باورچی کی طرح ہیں جو نمک تیز کر کے کہتا ہے نمک تو اچھا ہے۔ اہل اللہ اس حقیقت کو جانتے ہیں۔ اس لئے وہ اپنی طاعات پر کبھی نازاں نہیں ہوتے۔ حضرت غوث الاعظم رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ؎

من نگویم کہ طاعتم بپذیر قلم عفو برگنا ہم کش(۱)

اور فرماتے ہیں:

سحر گہ خروشاں کہ واماندہ اند

''صبح کے وقت گڑگڑا کر معذرت کرتے ہیں کہ ہمارا عجز قبول فرما''

رات بھر مجاہدہ کر کے صبح کو ہاتھ ملتے ہیں کہ ہائے منزل تک نہ پہنچے۔ مگر اس سے یہ نہ سمجھو کہ ناقص نماز، روزہ بیکار ہے۔ ہرگز نہیں۔ کیونکہ گو یہ حسنہ بھی ایک درجہ میں سیئہ ہے۔ مگر ترک صلوٰۃ وترک صوم اس سے بھی اشد سیئہ (۱) ہے اور یہ اس سے اخف ہے کیونکہ ایک تو وہ شخص ہے جو بادشاہ کے بلانے پر دربار ہی میں نہ آیا یہ تو باغی ہے اور ایک وہ ہے جو بلانے پر تو آ گیا۔

(۱) ''میں نہیں کہتا کہ میری عبادات قبول فرمائیے بلکہ گناہوں پر قلم پھیرنے کی درخواست کرتا ہوں'' (۱) اس سے بھی زیادہ گناہ ہے۔

مگر وہاں جا کر اِدھر اُدھر دیکھنے اور تاکنے لگا۔ یہ باغی نہیں۔ مگر ہاں کسی قدر مجرم ہے۔ پھر دوسری بات یہ ہے کہ اکثر تو حق تعالیٰ اس ناقص طاعت کو قبول ہی فرما لیتے ہیں کیونکہ ان کا کرم بہت ہی وسیع ہے۔ بعض اہل اللہ نے فَاُولٰٓئِكَ یُبَدِّلُ اللّٰهُ سَیِّاٰتِهِمْ حَسَنٰتٍ کی یہی تفسیر کی ہے کہ حق تعالیٰ ہماری طاعات کو جو واقع میں سیئات ہے اپنے کرم سے طاعات ہی شمار کر لیتے ہیں۔ نیز جماعت کی حکمتوں میں سے ایک حکمت علماء نے یہ بیان کی ہے کہ بہت سے نمازیوں میں سے کسی ایک کی نماز تو ضرور قبول ہوگی اور پیش ہوئی ہیں سب ساتھ ہی۔ سو حق تعالیٰ کے کرم سے امید قریب یہی ہے کہ مجموعہ میں سے اگر ایک کو بھی رکھ لیں گے۔ تو باقی کو واپس نہ کریں گے۔ جب کامل کو رکھیں گے تو اس کے ساتھ ناقص کو بھی رکھ لیں گے۔ بہرحال ان طاعات ناقصہ کو بھی بیکار نہ سمجھو۔ مگر کامل بھی نہ سمجھو۔ خلاصہ یہ کہ ڈرنے کی چیزیں بہت موجود ہیں۔ گناہ بھی اور طاعات بھی۔ اور جو کسی وقت دونوں سے بیکار ہو تو وہ غفلت بھی ایک درجہ میں ڈر ہی کی چیز ہے۔ غرض ان اسباب خشیت کے مطالعہ سے اپنے اندر خوف ہی پیدا کرو۔ کہ اگر حق تعالیٰ گناہوں سے اور طاعات کے نقص سے سوال کرنے لگے تو کیا ہوگا۔ اور اس خوف ہی کے ذریعہ سے توجہ پیدا کر لو۔ ان شاء اللہ اسی طرح خدا کا دھیان دل میں جم جائے گا۔

تعیین طریق

مقصود یہ ہے کہ خدا تعالیٰ سے لو لگ جائے۔ جس کے مختلف طریقے ہیں۔ کہیں محبت قائد ہوتی ہے کہیں خوف سائق ہوتا ہے(۱) اور دونوں طریقے مقبول ہیں۔

(۱) کہیں محبت پہنچا دیتی ہے اور کہیں خوف۔

حق تعالیٰ فرماتے ہیں: ﴿یَدۡعُوۡنَ رَبَّہُمۡ خَوۡفًا وَّطَمَعًا﴾

''وہ اپنے پروردگار کو ڈرتے ہوئے اور امید سے پکارتے ہیں''

توجہ الی اللہ کے مختلف طرق

پھر محبت کے بھی مختلف طرق ہیں کسی کو بواسطہ بشارات کے ہوتی ہے۔ اور کسی کو خود کمالات سے ان سب مذاقوں کی اصل نصوص میں موجود ہے۔ اور سب کا مرجع ایک ہی ہے۔ یعنی توجہ وتعلق اس لئے جو طریقہ حاصل ہو جائے۔ خواہ وہب سے خواہ اکتساب سے۔ اسی کو غنیمت سمجھ کر شکر کرو۔ یہاں سے میں اُن لوگوں کے کان کھولنا چاہتا ہوں جو دوسروں کی کیفیات دیکھ کر تمنا کیا کرتے ہیں کہ ہائے ہم کو بھی اسی نوع کی توجہ حاصل ہوتی۔ یہ غلطی ہے میاں جو تمہارے کرنے کا کام ہے تم وہ کرو پھر جو کچھ عطا ہو جائے اُس کو دولت سمجھ کر خوش رہو۔ طُرق کا معین کرنا حق تعالیٰ کا کام ہے جس کے لئے جو طریق مناسب ہوتا ہے۔ اُس کو وہی عطا فرماتے ہیں۔ اس میں تم دخل دینے والے کون ہو۔ پھر یہ اختلاف تو محض طُرق ہی میں ہے۔ باقی مقصود وہ تو سب میں مشترک ہے۔ یعنی توجہ الی اللہ اور تعلق مع اللہ چاہے تم کو حق تعالیٰ سے بلاواسطہ محبت ہو جائے یا بواسطۂ وعدہ حور وقصور کے یا جہنم کے خوف سے۔ ہر حالت میں توجہ الی اللہ تو حاصل ہے پھر اختلاف طرق سے کیا ضرر ہے۔ مولانا فرماتے ہیں ؎

اختلاف خلق از نام اوفتاد چوں بمعنی رفت آرام اوفتاد (۱)

اور خوب کہا ہے ؎

(۱) ''مخلوق کا اختلاف ''خالی'' نام سے واقع ہوا ہے۔ جب نام والے تک رسائی ہوگئی تو (تمام جھگڑوں سے) فراغت پائی''۔

عِبَارَاتُنَا شَتّٰی وَحُسْنُکَ وَاحِدٌ وَکُلٌّ اِلٰی ذَاکَ الْجَمَالِ یُشِیْرُ (۱)

اس لئے عارفین ان سب اختلافات کے ہوتے ہوئے بھی مقصود کو پہچان لیتے ہیں اور یوں کہتے ہیں ۔

بہر رنگے کہ خواہی جامہ می پوش من انداز قدت رامی شناسم (۲)

اس لئے وہ مختلف حالات والوں کی جدا جدا تسلی کرتے رہتے ہیں کیونکہ وہ مقصود کو پہچان کر دیکھ لیتے ہیں کہ ہر حالت اور ہر صورت کا منتہیٰ توجہ الی اللہ اور تعلق مع اللہ ہی ہے۔

اختلاف الوان

اور اختلاف طرق کی ایسی مثال ہے جیسے مساکین کو پلاؤ دیا گیا۔ مگر کسی کو تانبے کی رکابی میں کسی کو چینی کی رکابی میں اور کسی کو ہاتھ میں دے دیا گیا صورتیں اور الوان عطا کے گو مختلف ہیں۔ مگر حقیقت مقصود کی متحد ہے کہ سب کو پلاؤ ہی ملا ہے۔ بس اب میں ختم کرتا ہوں اس وقت میں نے ایک چھوٹی سی بات بیان کی ہے تاکہ یاد رہے۔ کیونکہ مختلف مضامین بیان کرنے سے سامع کو تشویش ہو جاتی ہے۔ اس لئے میں نے قصداً ایک ہی مضمون بیان کیا ہے اور اس کی کوشش کی ہے کہ سارا بیان اسی کے متعلق ہو چنانچہ بقدر ضرورت بحمد للہ بیان ہو گیا۔ اس کو یاد رکھیئے۔

خلاصہ وعظ

خلاصہ پھر عرض کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ سے تعلق حاصل کرو اور ہر وقت اُن سے لو لگائے رکھو کسی وقت غافل نہ ہو کیونکہ وہ وقتاً فوقتاً تمہاری طرف متوجہ ہوتے

(۱) ''ہماری تعبیریں مختلف ہیں لیکن تیرا حسن تو ایک ہی ہے سب تعبیریں اسی طرف مشیر ہیں'' (۲) ''جس طرح کا تو چاہے لباس پہن لے میں تو تیرے قد وقامت سے تجھ کو پہچانتا ہوں''۔

رہتے ہیں۔ تو ایسے وقت تمہارا غافل ہونا ستم ہوگا اور نظم میں سارے بیان کا خلاصہ یہ شعر ہے ؎

یک چشم زدن غافل ازاں شاہ نباشی شاید کہ نگاہے کند آگاہ نباشی(۱)

باقی اس کا طریقہ یہ کہ لو کس طرح لگے اجمالاً تو میں بتلا چکا ہوں۔ تفصیلاً۔ ایک جلسہ میں کیونکہ بیان کردوں۔ تفصیل کاملین سے پوچھو اور تفصیل ہو بھی نہیں سکتی۔ کیونکہ ہر شخص کے لئے تعلق مع اللہ کا طریقہ جدا ہے کیونکہ امراض ہر ایک کے جدا ہیں(۱) تو ایک جلسہ میں ہر شخص کے لئے الگ الگ طریقہ بیان کرنا اس مثل کا مصداق ہے ایک انار وصد بیمار(۲)۔ پس تفصیل کو دوسرے وقت پر رکھو اور کاملین سے مل کر الگ الگ اپنے لئے تعلق مع اللہ کا طریقہ دریافت کرلو۔ اس وقت تو مجھ کو اجمالاً متنبہ کرنا مقصود تھا کہ یہ ایسا ضروری مضمون اور ہم کو اس پر مطلق توجہ نہیں۔

اب دعا کیجئے کہ حق تعالیٰ ہم کو اپنی طرف متوجہ ہونے کی توفیق عطا فرماویں اور ہماری غفلت کو دور فرماویں۔ (آمین)

وصلی اللّٰہ علی سیدنا ومولانا محمد وعلی آلہ واصحابہ اجمعین واخر دعوانا ان الحمد للّٰہ رب العلمین

(اشرف علی)

۱۹۔ رمضان المبارک ۱۳۵۰ھ(۳)

---

(۱) ''ایک گھڑی کے لئے بھی اس مالک حقیقی سے غافل نہ ہو بہت ممکن ہے کہ وہ نگاہ فرمادیں اور تجھے خبر بھی نہ ہو'' (۱) امراض الگ الگ ہیں (۲) ایک انار سو بیمار (۳) اللہ تعالیٰ سب قارئین کو توجہ الی اللہ اور تعلق مع اللہ نصیب فرمائیں۔ آمین

خلیل احمد تھانوی

۳/ ذیقعدہ ۱۴۳۷ھ